عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

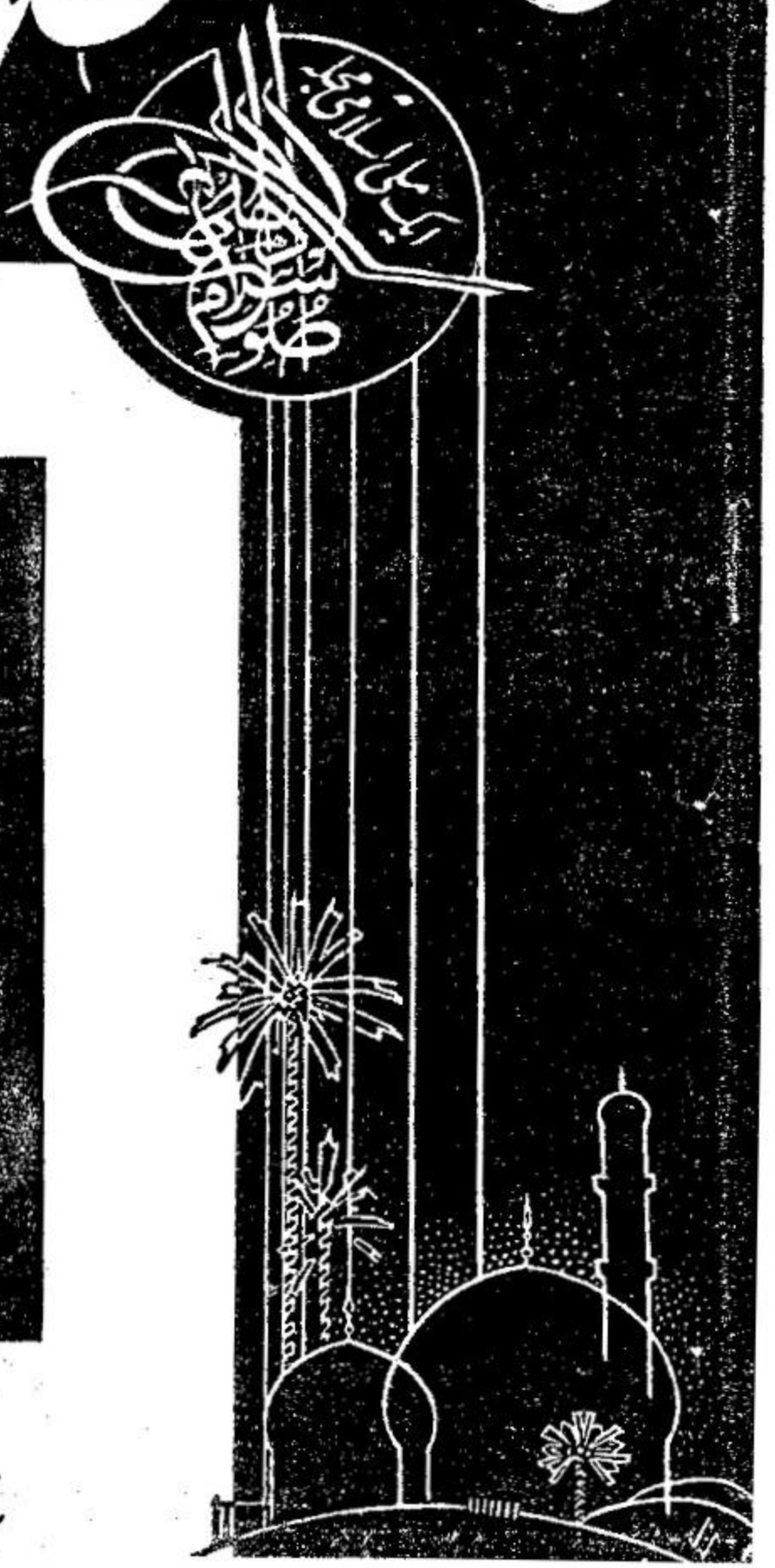

اکتوبر ۱۹۴۰ء

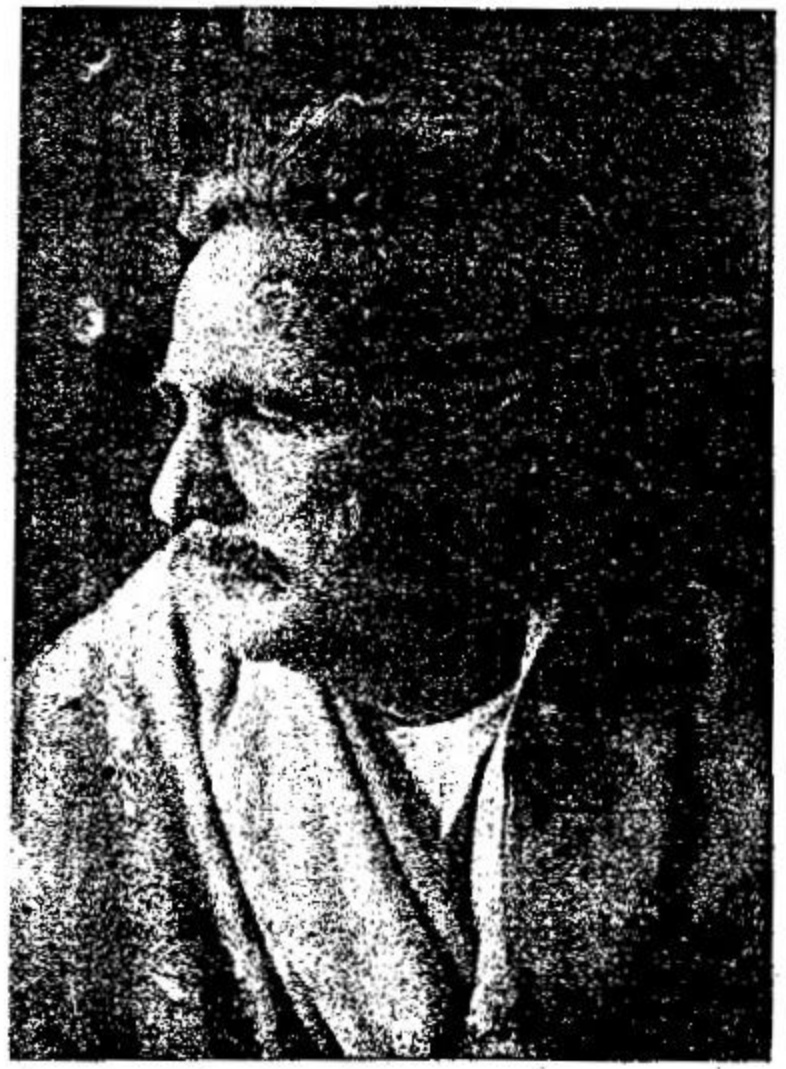

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتّب

اخوندزادہ حسین امام

جلد (۳) شمارہ (۱۰)

بدلِ اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ ۵/-

ششماہی تین روپے ۳/-

فی پرچہ آٹھ آنہ ۸/

شعبان المعظم ۱۳۵۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۱ — ۸
حکومت الٰہیہ	شہزادہ سعید حلیم پاشا (شہید)	۹ — ۳۷
نقد و نظر	ادارہ	۳۸ — ۴۰
سلیم کے نام پانچواں خط	از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۴۱ — ۴۸
باب المراسلات		۴۹ — ۶۴
حقائق و عبر	ادارہ	۶۵ — ۷۷
سب کی بولی	ادارہ	۷۸ — ۸۳
توجہ طلب!		۸۴

لمعات

کچھ نوجوانوں سے

یوں تو قصص قرآنی میں سے ہر ٹکڑہ اپنے اندر عبرت وموعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگۂ دور رس غور و تدبر سے اس کی گہرائیوں تک پہونچتی ہے اس کے حقائق و بواطن زمانہ کے پیچ در پیچ غوامض کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن قصۂ بنی اسرائیل کو ان قصص میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس داستان میں قوموں کے عروج وزوال کے اصول ومبادی اس خوبصورتی سے سمٹا کر رکھدیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر وحکم کی ایک مستقل دنیا بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے، ملوکیت کی سرکش طغیانیاں، سیاستِ ابلیسی کی خواب آور فریب کاریاں۔ اور سرمایہ داروں کی پرسکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ایک ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن سوچئے کہ جس دور میں یہ تینوں افعی یکجا جمع ہوجائیں وہاں خدا کی مخلوق پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی؟ تاریخ مصر کا یہی وہ دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح وبسط سے آیا ہے۔ **فرعون**۔ استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ **ہامان**۔ ابلیسانہ سیاست کی روباہ بازیوں کا زندہ پیکر۔ اور **قارون** سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمایندہ۔ تینوں ایک جگہ اور ان کے پنجہائے آہنی کے نیچے بنی اسرائیل کی شکل میں تڑپتی پھڑکتی۔ انسانیت۔ آپ سمجھتے ہیں کہ بیکس ومظلوم انسانوں کو ان سرکش قوتوں کے دندانِ حرص و آز اور پنجۂ خون آلود سے چھڑانے کے لئے کس قدر کوہ تمثال۔ پیکر جلال وجبروت مصلح اعظم کی ضرورت تھی جو اللہ کی نصرتوں کو ساتھ لئے باطل کی ان انسانیت سوز قوتوں کے استیصال کے لئے میدان میں آئے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَھَامَانَ وَقَارُوْنَ. حضرت موسیٰؑ

تشریف لائے اور خدا کی طرف سے غلبۂ سطوت کی کھلی کھلی نشانیوں کو ساتھ لیکر ان کی طرف بڑھے۔ یہ اتنی بڑی مہم تھی کہ ان کی رفاقت و حمایت کے لئے ایک اور نبی (حضرت ہارونؑ) ان کے ساتھ کئے گئے۔

یہ حضراتؑ مامور من اللہ تھے۔ اس لئے ان کے ماحول کا ان پر کچھ اثر نہ تھا لیکن انھوں نے جس قوم کو ساتھ لے کر جورو استبداد کی ان قوتوں کو کچلنا تھا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے قوائے عملیہ مضمحل ہو چکے تھے، نہ سینے میں دل باقی تھا اور نہ دل میں زندگی کی کوئی آرزو، نہ سامنے کوئی نصب العین حیات تھا نہ اس نصب العین کے حصول کے لئے کوئی سباب آسائش۔ ملوکیت کے استبداد نے ان کی خودی کو فنا کر دیا تھا سیاسی حربوں کے سحر آگیں اثرات ان کے جوہر مردانگی سلب کر چکے تھے۔ سرمایہ داری کے طوق و سلاسل نے ان کے جذبات حریت و آزادی کو بری طرح سے جکڑ رکھا تھا۔ قوم غالب کے عام انسان انھیں دیو نظر آتے تھے۔ یہ ان سے ڈرتے، خوف کھاتے تھے۔ ان کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، ایک اولوالعزم پیغمبرؑ انھیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ تمہارے نام لکھی جا چکی ہے بس اس میں داخل ہونے کی دیر ہے کہ یہ تمہاری ہے لیکن ان پر اس قدر خوف و ہراس طاری ہے کہ وہ باہر بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ (یموسیٰ انا لن ندخلھا ابدًا مادامو فیھا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون ۵) اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں۔ تم اگر وہاں جانے پر ایسے ہی تلے بیٹھے ہو تو تم خود چلے جاؤ اور اپنے خدا کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ تم دونوں وہاں لڑتے رہنا۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کی ان نادانوں اور حیوانوں کے سامنے جھکی ہوئی گردنوں کو بصد مشکل اوپر اٹھا کر انھیں شرف انسانیت سے آگاہ کیا۔ لیکن ان کی حالت یہ کہ یوں ہی ایک قوم کو بتوں کے سامنے سجدہ ریز دیکھا۔ حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایک ایسا ہی بت بنوا دیجئے! حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے اعتکاف کی غرض سے تشریف لے گئے، حضرت ہارونؑ ان کے اندر بیٹھے ہیں لیکن ایک سامری اٹھا اور اس کے کہنے سے ان سب نے اپنی گردنوں کو پھر سے سونے چاندی کے ایک بت کے سامنے جھکا دیا۔ یہ سب اس لئے تھا کہ غلامی ان کے رگ و ریشہ میں حلول کر چکی تھی، مدتوں کی محکومیت سے ان کی ہمتیں پست، ان کے حوصلے سرد، اور انکی قوتیں مفلوج کر دی تھیں۔ اس لئے ان میں ایمان محکم پیدا ہو سکتا تھا اور نہ عمل پیہم کی سعادت ان کے حصہ میں

آسکتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ (انها محرمة عليهم اربعين سنة يتيهون في الارض)
جب ان کی یہ حالت ہے تو وہی سرزمین جو ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ ان پر چالیس برس تک
حرام کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ اس بیابان میں سرگرداں پھرتے رہو۔ حضرت موسیٰؑ
آب وگل کے ان بے جان پیکروں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے
انھیں شہروں کی غلام ساز فضا سے دور رکھا وہاں بھی ان کی حالت یہ رہی کہ خدا کی نعمتیں من وسلویٰ
کی شکل میں ملتی ہیں۔ لیکن شہروں کے چٹپٹے کھانوں کی یاد انھیں ستاتی ہے۔ چالیس برس تک یہ قوم
یوں ہی دشت نوائی اور صحرا پیمائی کرتی رہی۔ تاآنکہ اس قوم کے تمام پرانے افراد سوا چند ایک کے۔ ایک ایک کرکے
اٹھ گئے۔ اور اس کے **نوجوان** جنھوں نے آزادی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے
گرد پروانہ وار جمع ہو گئے، یہ نوجوان نئے دماغ۔ نئی زندگی۔ نئی آرزوؤں کو لیئے ہوئے حضرت موسیٰؑ
کے ہاتھ پہ ایمان لائے۔ (فما امن لموسیٰ الا ذریة من قومه) حضرت موسیٰؑ جان فروش
مجاہدین کی اس جماعت کو ساتھ لے کر لوٹے اور اس کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ فرعون کی فرعونیت
ہامان کی سیاسی چال اور قارون کے دولت کے انبار دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور وہی محکوم ومغلوب
قوم جو کل تک نہایت ذلیل وحقیر شمار کی جاتی تھی قوم غالب کے املاک وخزائن اور تاج وتخت کی
وارث بن گئی۔ هٰذا بصائر للناس وهدى ورحمة لقوم يوقنون۔

بنی اسرائیل کا قصہ ہمیں پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ قوموں کی زندگی میں انقلاب ہمیشہ **نوجوانوں**
کے ہاتھوں سے رونما ہوا کرتا ہے بشرطیکہ ان نوجوانوں کے قلب ونظر کی تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے
غلامی کی مسموم فضا سے محفوظ رکھ کر انھیں انسانوں کی زندگی بسر کرنے کا ڈھب سکھایا جائے۔ یہی وہ
نوجوان ہوں گے جن کے ہاتھوں قوم کے مقدرات کے ستارے بنیں گے۔ قوم غالب کی سیہ کاریاں
اس لم سے واقف ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس قسم کے "نرم ونازک" حربے استعمال کرتی
رہتی ہیں۔ جن کی سحر آفرینیاں قوم مغلوب کے نوجوانوں کے دل ودماغ کو حریت فکر ونظر سے محروم

رکھیں اور وہ عافیت کوشی اور سہل انگاری کی نسوانی زندگی کے خوگر ہو کر یہ بھول جائیں کہ دنیا میں مردوں کے کرنے کے کیا کام ہیں، قوم کے بڑے بوڑھوں سے کوئی گلہ نہیں۔ جب ان سے کوئی توقع ہی نہیں تو پھر گلہ کس بات کا؟ ان میں کسی سے جب اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے تو اسے اس کے لئے متعین کر دیتا ہے۔ باقی تمام فالج کے مریضوں کی طرح مردم شماری کے رجسٹر میں نام لکھانے کے لئے جیا کرتے ہیں۔ (ہم نے پچھلی اشاعت میں ان بوڑھوں کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ بھی ایک واقعہ کا اظہار تھا۔ شکایت نہ تھی) البتہ جس چیز کا غم ہمیں کھائے جا رہا ہے وہ قوم کے نوجوانوں کی حالت ہے۔ ان کے دل و دماغ حاکم قوم کے وضع کردہ تعلیمی قالب میں ڈھلتے ہیں، وہ قالب ان نوجوانوں کی صلاحیتوں کو صرف اس حد تک بڑھنے دیتے ہیں جس حد تک حکومت کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہم نے ایک سرکاری عمارت کے سامنے اِدھر اُدھر بہت سے خوبصورت پیڑ دیکھے دور سے یوں نظر آتے تھے جیسے کھلی ہوئی چھتریاں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اعلیٰ درجہ کے نارنگی کے درخت ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے مقصود محض زیبائش صحن ہے اس لئے جوں ہی کوئی شاخ فطرت کے تقاضہ سے اُبھرنے کی کوشش کرتی ہے اُسے قلم کر دیا جاتا ہے اور اس طرح ان درختوں کو چھتریوں کے قالب میں ڈھال رکھا ہے، چنانچہ ہم نے ان کے پھلوں کو دیکھا تو رنگ نہایت شوخ۔ لیکن نہ خوشبو نہ ذائقہ۔ یہی مقصد تعلیم سے ہے کہ نوجوانوں کی صلاحیتوں کو صرف قومِ غالب کے مصالح کی حد تک بڑھنے دیا جائے۔ ایک تو تعلیم ایسی ناقص۔ اس پر ذرائع معاش کی کمی۔ نوجوانانِ قوم کے عمدہ عمدہ دماغ سب ملازمتوں کی نذر ہو جاتے ہیں نہیں شریک حکم" تو کیا نہیں جاتا۔ البتہ ان کے "جوہر ادراک" نہایت سستے داموں خرید لئے جاتے ہیں۔ اور پھر ان پر پابندیاں اس قدر سخت عائد کی جاتی ہیں کہ یہ کسی اور طرف خیال تک بھی نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں کے پاس معاش کے اتنے متنوع وسائل ہیں کہ ان کے نوجوانوں کے چند ایک دماغ اگر ملازمتوں میں صرف ہو جاتے ہیں تو بقایا اکثریت آزاد پیشے اختیار کر لیتی ہے، صنعت و حرفت ان کے قبضہ میں۔ تجارت پر ان کا تسلط۔ آزاد تعلیمی درسگاہیں ان

کے پاس - ان کے بہترین دماغوں کے لئے بہترین پرورش گاہیں اور پھر ان سے کام لینے کے لئے موزوں ترین شعبے، ہر وقت موجود ہیں - ہمارے ہاں کا امرار کا طبقہ ایسا ہے جنہیں ملازمتوں کی ضرورت نہیں - لیکن اول تو امرار کے بچے بالعموم سہل انگار اور عشرت پسند ہوتے ہیں، اس لئے ان میں عمدہ دماغ بہت کم نکلتے ہیں - اس پر طوق محکومیت کی لعنت کہ ابھی تک ملازمتوں کو وجۂ افتخار سمجھا جاتا ہے - اچھے اچھے مرفہ الحال زمینداروں کے لڑکوں کو دیکھئے باپ دادا کے "کارناموں" کی سندات شیشے کے چوکھٹوں میں جڑی ہوئی - بغل میں دبائے مارے مارے پھر رہے ہیں کہیں "حوالداری" کی آسامی مل جائے - بہترین دماغوں کا یہی طبقہ (Intelligentia) تھا جسے قوم کی راہ نمائی کا کام کرنا تھا - وہ یوں ضائع ہو رہا ہے - کہئے کہ کل کو قوم کے اجتماعی مسائل کی گتھیاں کون سلجھائیگا ؟ ہمارے بڑے بوڑھوں نے اس اولین فریضہ سے چشم پوشی کی - اس کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں - جو مجرمانہ تغافل آج ہم سے سرزد ہو رہا ہے اس کی سزا ہماری آنے والی نسل بھگتے گی - فرض کیجئے کہ زندگی کی جس سیاسی کشاکش سے آپ آج گزر رہے ہیں اس میں آپ کامیاب ہو جائیں اور آنے والی حکومت میں آپ کو حسب خاطر حصہ مل جائے - یا آپ کی جداگانہ حکومت ہی قائم ہو جائے تو اس وقت وہ کون سے لوگ ہوں گے جن کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت دی جائیگی؟ یہ قحط الرجال ہی تو تھا کہ آپ کو پنجاب کی حکومت ایسے مسلمانوں کے سپرد کرنی پڑ گئی جن کے ہاتھوں آپ ہر روز نالاں ہیں - اس سے زیادہ آپ کی تہی مائیگی کا اور کیا ثبوت ہوگا کہ حکومت ہند کی مجلس اعیان میں مسلمانوں کا نمایندہ وہ ہے جو (اپنی مٹھی بھر جماعت کے علاوہ) تمام ہندوستان (بلکہ روئے زمین) کے مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا - لیکن سوال تو یہ ہے کہ اگر آج آپ اپنی اس تہی دامنی کے ہاتھوں اس درجہ ماتم کناں ہیں تو آپ نے کل کے لئے اس کا کیا انتظام کیا ہے ؟ حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد اور حکومت سنبھالنے والوں کی تخلیق و پرورش سے اس درجہ تغافل پیشگی ! اگر مسائل حیات سے کھیل کھیلنا نہیں تو اور کیا ہے ؟ لیکن اصل تو یہ ہے کہ "حکومت حاصل کرنے" کا سودا ہی کسی سر میں ہے ! مسلمانوں نے تو کچھ یوں سمجھ رکھا ہے کہ جتنی جدوجہد ہو رہی

ہے۔ یہ مسٹر جناح کا کوئی ذاتی معاملہ ہے جس میں اس کی مدد کرنا اس پر احسان دھرنا ہے اور اگر اس کی مدد نہ بھی کی جائے تو اُسے بہرحال یہ "اپنا" کام کرنا ہی ہے۔ ہم مفت کی دردسری کیوں مول لیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہونا چاہیئے اُسے یہ بڑے بوڑھے کریں کیوں؟ اور اگر وہ نہ کریں تو پھر اور کون کرے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام تو خود نوجوانوں ہی کے کرنے کا ہے۔ آج کی غفلت شعاری کے انجام و عواقب سے انھیں کو دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ بڑے بوڑھے تو اُس وقت کسی اور دنیا میں ہوں گے۔ اس لئے اگر آج نوجوان اس حقیقت سے اغماز برت رہے ہیں تو یہ ان کی خودکشی کے مرادف ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ نوجوان دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں اس لئے یہ از خود کچھ نہیں کرسکتے۔ دست نگر تو یہ اس وقت تک رہتے ہیں جب تک اپنی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے۔ جب انھیں اپنی قوتوں کا احساس ہو جائے گا تو زمانہ ان کا دست نگر ہوگا ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نوجوان سب کچھ کرسکتا ہے بشرطیکہ یہ خود آگاہ ہو جائے۔ ہمیں علم ہے کہ قوم میں ایسے نوجوان بھی موجود ہیں جن میں تڑپ ہے، خلش ہے۔ سوز ہے گداز ہے۔ کام کرنے کی صلاحیت ہے، عمل کی ہمت ہے، ولولہ ہے، اُمنگ ہے، جذبہ ہے۔ احساس ہے۔ لیکن قوم سے انفرادی بھیک نہیں مانگنا چاہتے۔ وہ صرف ارتباط جسم و جان کے لئے کچھ چاہتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ انھیں آستان افتادہ سمجھ کر گداگری کا ٹکڑا ان کی جھولی میں نہ ڈالا جائے بلکہ قوم ان کا احسان مانے کہ اُنھوں نے اپنی زندگیاں قوم کے لئے وقف کردی ہیں۔ ان نوجوانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے اور وہ کون ہے جو اس کی حمایت نہ کرے گا؟ آج بدبختی سے ہمارے پاس کوئی ایسا ادارہ نہیں جو اس قسم کا اجتماعی بندوبست اپنے پاس رکھتا ہو جو ان نوجوانوں کی ضروریات زندگی کی

کفالت کرے اور ان کی صلاحیتوں سے موزوں ترین کام لے - ہمارے پاس اس قسم کے نوجوان پہنچتے رہتے ہیں لیکن ہم میں خود اتنی استطاعت نہیں کہ اس قسم کا کوئی بندوبست کرسکیں ۔ قوم میں مرفہ الحال لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے ، اور ان میں سے بعض بہت کچھ خرچ بھی کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ سب کچھ انفرادی طور پر ہوتا ہے - اس لئے اس سے کوئی خاطرخواہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا - اس کے لئے دونوں طرف سے قدم اٹھنے چاہئیں ایک طرف سے تعلیم یافتہ طبقہ سے وہ نوجوان جو اپنی زندگیاں اس کام کے لئے وقف کرنا چاہیں آگے بڑھیں ۔ دوسری طرف سے ارباب ثروت میں سے جو لوگ ان نوجوانوں کی ضروریات کا ذمہ لینا چاہیں وہ آگے آئیں اور کوئی ادارہ ان دونوں کے درمیان ربط وضبط پیدا کرنے کا ذریعہ (Coordinating Agency) بن جائے - جب تک کوئی اور ادارہ اس خدمت کو اپنے ذمہ نہیں لیتا - اس وقت تک ادارۂ طلوع اسلام اس مقصد کے لئے حاضر ہے - اگر اس سے بہتر کوئی اور تجویز آپ کے سامنے ہو تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیے ۔ واضح رہے کہ نوجوانوں کی اس جماعت سے کسی قسم کی خفیہ سازش کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا - ان کا مقصد حیات نوجوانانِ ملت کے اندر صحیح اسلامی زندگی کے احساسات کو بیدار کرنا ہوگا - تحریر سے - تقریر سے - باہمی ربط وضبط سے ، اور یہ سب کچھ واضح الفاظ میں ۔ بالکل کھلے بندوں ہوگا - اس میں شبہ نہیں کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے پیش نظر یہ اقدام بہت معمولی سا ہے ۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تجویز عمدہ ہے ، تو نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال اچھا ہے - اگر یہی دو چار نوجوان جن سے اس اسکیم کی ابتداء ہو - دو ایک برس میں نوجوانوں کی ایک مختصر سی جماعت بھی اپنے ساتھ ملالیں - تو اس کے بعد کم از کم تعلیمی درسگاہوں کا صحیح ہاتھوں میں چلے جانا کچھ بعید نہ ہوگا - اور جب ایک مرتبہ آپ کی تعلیمی درسگاہیں صحیح ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی تو اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے وقت کے نوجوانوں کی جماعت پیدا کرلینا کچھ مشکل نہ ہوگا ۔ ؎

اے کہ منزل رانمے دانی زراہ قیمت ہر شے زاندازِ نگاہ
نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود ایں زمین وآسماں دیگر شود

لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح خود غلامی کی زندگی جئے اور غلامی کی موت مرے ۔ اسی طرح آپ کی آئندہ نسلیں بھی غلام پیدا ہوں ۔ اور غلامی کی لعنتی زندگی میں اپنی عمر بسر کریں ۔ تو پھر جس طرح سے گزر رہی ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ یہ تو فقط احساس پر منحصر ہے ۔ جنہیں آج کسی فرعون کو خدا تسلیم کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی ۔ انھیں کل کسی "سامری" کے گوسالہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جانے میں کیا باک ہوگا !

(۲)

اشاعت زیر نظر میں شاہزادہ سعید حلیم پاشا مرحوم کے مضمون "حکومت الٰہیہ" کی دوسری (مکمل) قسط شائع ہو رہی ہے ۔ اس کی پہلی قسط اگست کے پرچہ میں شائع ہوئی تھی ۔ مضمون کی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ آپ قسط اول کو ایک مرتبہ پھر سے دیکھ لیں اور اس سے ملحق قسط دوم کا مطالعہ فرمائیں ۔

کئی مضامین کتابت شدہ التوا میں ڈالنے پڑتے ہیں کہ رسالہ کی ضخامت پوری ہو جاتی ہے ۔ آپ کی شکایت بجا ہے کہ پرچہ جلدی ختم ہو جاتا ہے ۔ لیکن ہماری مجبوریوں کی طرف بھی دھیان رکھئے ۔ کہ ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

حکومتِ الٰہیہ

بقلم شہزادہ سعید حلیم پاشا (شہید)

قسط دوم

عہدِ انحطاط

پچھلی دو صدی سے ملت اسلامی کامل انحطاط کے عالم میں ہے۔ گو اسلامی اقوام کے معتقدات میں کوئی خلل نہیں آیا اور وہ شریعت کی فرمانروائی کے اصول کو اسی طرح مسلم جانتی اور تا مقدور اسلام کے برگزیدہ شعائر و احکام کی پیروی کر رہی ہیں۔ لیکن اگر وہی اسباب پہلے کے سے اثرات نہیں پیدا کر رہے اور اسلام کا عمل عہد ماضی کی طرح نتیجہ خیز نہیں نظر آتا تو بے شبہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلامی قومیں اپنے فرائض کو اسی طرح ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتیں جیسی پہلے رکھتی تھیں۔

لوگوں نے ملت اسلامی کے زوال کے عجیب عجیب اسباب بیان کئے ہیں جو کم و بیش غلط اور بے سر و پا قیاس آرائیاں ہیں۔ معاندین اسلام تو یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے قوانین کو اس زوال کا سبب قرار دیا، حالانکہ ایسا کہنا نہ صرف تاریخی اور عقلی اعتبار سے باطل ہے بلکہ خود معترضین کا دل اس واہی خیال کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ لوگ خواہ مخواہ بھی کہے جاتے ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ اس وقت تک دوسروں سے اسی طرح پست و کمتر رہیں گے۔ اسلام کے ان بغض و عداوت رکھنے والوں کی

تردید کچھ دشوار نہیں۔ مگر میں ان لوگوں سے بحث و مباحثے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا جو محض کورانہ تعصب اور قلبی سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ میں صرف اس عدم قابلیت کو صحیح صحیح بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو دنیا کے مسلمانوں میں اپنے اسلامی فرائض پہچاننے کے متعلق پیدا ہوگئی ہے۔ ملت اسلامی کے زوال کا واحد سبب یہی عدم قابلیت ہے۔ اس کو معلوم کرنے سے ہم اپنے زوال کی صحیح نوعیت کا تعین کر سکیں گے۔ اور اسی کے ساتھ اُسے دفع کرنے کی تدابیر بتا سکیں گے۔

اس بارے میں ہمیں دو سوالوں کا جواب دینا ہے:۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے زوال و ادبار کی علامتیں کیا ہیں؟ دوسرے وہ اسلامی فرائض کیا ہیں جنہیں اسلامی قومیں آج کل اتنی کامل پابندی سے ادا نہیں کرتیں جیسے پہلے کیا کرتی تھیں؟

یہ کہنا قرین انصاف نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں آزادی، مساوات اور یکجہتی مفقود ہوگئی جب کہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں کسی ذات پات یا قوم و نسل کی لڑائی اور کشمکش جیسے پہلے نہ تھی آج بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلامی اُخوت پہلے سے بھی زیادہ نمایاں اور عملی صورت میں ظہور کر رہی ہے شریعت کی توقیر و احترام میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اور اُمت مسلمہ آج بھی اس پر پورا اعتماد اور ایمان رکھتی ہے۔ حقیقت میں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بارے میں اسلامی قومیں زوال و انحطاط کے باوجود مغربی قوموں سے زیادہ خوش نصیب ہیں جہاں کسی قسم کی حکومت لوگوں کے دل میں احترام و اعتبار پیدا نہیں کر سکتی۔ بلکہ روز افزوں سرکشی کے ساتھ ٹھکرائی جا رہی ہے۔ یہاں تک تو مسلمان یورپ کی قوموں سے یقیناً اچھے ہیں لیکن جس وقت ہم مادی یا معاشی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو بدنصیبی سے مسلمانوں کا حال فگر گوں نظر آتا ہے۔ اسلامی قوموں کی نکبت و پستی کا اصلی راز اور ان کے جگر کا ناسور یہی ہے۔ اس معاملے میں مغربی قومیں ان سے ہر طرح جیت ہی جیت میں ہیں بلکہ جس نسبت سے مغربی اقوام کی مادی خوش حالی اور زر و دولت کے اقتدار میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے اسلامی آبادیوں کی دولت

گھٹی ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا حال فی الواقع قابل رحم ہے اور انھیں یورپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور وہ اس کی ثروت و خوشحالی دیکھ کر رشک کریں تو بالکل بجا ہے۔

اسلامی دنیا کی مادی حالت میں خرابی کا نتیجہ اس کا سیاسی زوال ہوا۔ افلاس نے مسلمانوں کو ناتوان کر دیا اور ساز و سامان کی کمی نے اس قابل نہ رکھا کہ وہ یورپ کے طالبانِ اقتدار و جاہ کی دراز دستی کا مقابلہ کر سکتے۔ پس انھیں محکومی کی جملہ آفتوں اور ذلتوں کو برداشت کرنا پڑا[1]۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو اپنے مذہب سے جو شیفتگی اور جوش عقیدت مندی تھا۔ ان تمام آفات و مصائب کے باوجود اس میں ایک لمحے کے واسطے بھی کمی نہ آئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین اسلام کا لوگوں کے دلوں پر کیسا کچھ قبضہ اور اقتدار ہے۔ اور نہ یہ مصیبتیں، اسلامی دنیا کی اقتصادی اور سیاسی تباہی کے باوجود، مسلمانوں کے تمدن کو نابود اور غارت کر سکیں۔ جس سے اسلامی تنظیم کی قوت کا پتہ چلتا ہے۔

واضح رہے کہ مادی اقتدار اور خوش حالی اُن لوگوں کا حصہ ہیں جو فطرت کے تسلّط یافتہ قوانین کو دریافت کرتے اور اس علم کے ذریعہ سے فطرت کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا جانتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کے انحطاط کی علّتیں تلاش کرتے کرتے آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انحطاط کا اصلی سبب مسلمانوں کا وہ جہل ہے جس سے بچنے اور ہوشیار رہنے کی نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) نے اہل ایمان کو تاکید کی تھی۔

لیکن اسلامی قوموں کی حالت اس جہل کی بدولت کیسی ہی خراب اور قابلِ تاسف کیوں نہ ہو مطلق مایوسی کے لائق نہیں ہے۔ ان کا انحطاط، مادّی اور اقتصادی ہے اور اس کا مداوی کچھ بہت دشوار نہیں۔ اخلاقی اور تمدّنی اعتبار سے اسلامی نظام ساری مصیبتوں کو جھیل گیا۔ اور

---

[1] "الفقر سواد الوجه فی الدارین" (الحدیث) "کا دالفقر ان یکون کفرًا"

افلاس دنیا اور آخرت کی روسیاہی کا موجب ہے — بسا اوقات افلاس کفر کا موجب بنتا ہے

قائم رہا اور یہ نہایت اہم حقیقت ہے جس پر ہم اپنے آپ کو مبارک باد دے سکتے ہیں۔

اہل خانقاہ

مسلمانوں کے انحطاط کا جو سبب میں نے تشخیص کیا ہے۔ اسلامی دنیا کی تاریخ سے اس کے قطعی شواہد فراہم ہو سکتے ہیں۔ یہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی دنیا میں انحطاط کے آثار ٹھیک اُس زمانے میں نمودار ہوئے جبکہ مسلمانوں میں ایک خاص قسم کے "اہل مدرسہ" پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کا مذہب دینی عقاید میں خواہ مخواہ موشگافیاں کرنے اور باریکیاں نکالنے کا قطعاً مخالف ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں پیشوایانِ مذہب کا کوئی خاص فرقہ نہیں۔ مگر مذکورہ بالا ملّائی گروہ نے یہ عقیدہ لوگوں میں پھیلا دیا کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طلبِ علم اور تحقیق و تلاش کی جو بار بار تاکید فرمائی ہے وہ صرف شریعت کے رموز و حقائق سے متعلق ہے اور آدمی کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو انھیں پر غور و خوض کرنے میں مشغول رہے۔ سچ پوچھیئے تو منشائے نبوی کی یہ تعبیر ایک قسم کی خودرائی تھی۔ کیونکہ شریعت کے اخلاقی اور تمدنی احکام بتانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیہم اصرار فرماتے ہیں کہ ہم اپنی ذاتی کوشش سے جس قدر زیادہ ممکن ہو علم حاصل کریں اور اپنے آپ کو زیادہ واقف اور باخبر بناتے رہنے میں کبھی دم نہ لیں حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ علم و حکمت سے ہم اپنے دین کو اور بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور جس قدر زیادہ علم ہوگا اسی قدر بہتر عمل کر سکیں گے۔ اس تعلیم کا مبارک منشا یہ ہے کہ جس طرح حضور رحمۃ للعالمین نے شریعت کے ذریعہ سے ہماری اخلاقی اور تمدنی راحت و خوش حالی کا سامان مہیا فرمایا۔ اسی طرح آپ صلعم چاہتے تھے کہ ہم اپنی کوشش سے فطرت کے اسرار معلوم کر کے دنیاوی اور مادی خوش حالی سے بھی بہرہ مند ہوں جو اس اخلاقی آسودگی کے مثل اور مناسب ہو۔ لیکن اہل مدرسہ اور اہل تصوّف نے مسلمانوں میں رفتہ رفتہ ایسا رواج پایا کہ دماغوں پر انہی کا تسلط جم گیا۔ حالانکہ یہ سارا کام ان مصنوعی علماء کا تھا جو اپنے آپ مسلمانوں کے پیشوا بن بیٹھے تھے۔ بہرحال اہل مدرسہ کے اس غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا کی قوانینِ فطرت کے مطالعے سے دلچسپی روز بروز کم ہوتی گئی اور اس نے علوم طبیعی کو قریب قریب بالکل ترک کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں میں

مادی قوت اور آسودگی کے حصول کی صلاحیت بداہتہً مفقود ہونے لگی جس کی انھیں اس لئے احتیاج تھی کہ وہ آزادی سے رہ سکیں اور بیرونی حملوں سے اپنی خود مختاری کو بچا سکیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ اپنے سیاسی اور اقتصادی زوال کے باعث خود مسلمان ہیں۔

اس اثنا میں کہیں کہیں بعض مسلمانوں نے قوم کو اُبھارنے کی جو کوششیں کیں اُن میں کچھ کامیابی نہ ہوئی اور ادھر اہل مغرب سے میل جول اور خاص کر ان کی پھیلائی ہوئی تعلیم کا یہ اثر پڑا کہ اسلامی دنیا کو یقین ہو گیا کہ شریعت کے قوانین زمانۂ حال کی مادی ترقی کے اسباب و لوازم سے تضاد و تخالف رکھتے ہیں۔ اس غلط اور تباہ کن خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ تو یہ سمجھے کہ ہمیں اپنے اسلامی اخلاق اور تمدن برقرار رکھنے کی خاطر دنیاوی سود و بہبود پر لات مارنی چاہئے۔ یعنی قوانین شریعت پر سے قوانین ترقی کو قربان کر دینا چاہئے۔ اور ان کے برخلاف ایک گروہ نے یہ سوچا کہ عقلمندی اسی میں ہے کہ اپنے دنیاوی اختیار کے لئے شریعت کے قواعد و قیود کو بالائے طاق رکھ دیا جائے حالانکہ درحقیقت دنیاوی صلاح و فلاح اور دینی قوانین نہ صرف باہم دمساز بلکہ ایک دوسرے کا تتمہ ہیں مگر ہمارے پہلے گروہ کو تو یہ اُمید تھی کہ دنیاوی سود و بہبود سے قطع نظر کر لی جائے گی۔ تو اسلام کا وہی شان دار گو بعید زمانہ پھر عود کر آئے گا۔ اور یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اخلاق اور تمدن کی بہتری کا لازمہ دنیاوی ترقی اور خوش حالی ہے۔ باقی دوسرا گروہ اس خیال میں رہا کہ شریعت کو فرماں روائی سے معزول کر کے وہ ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھے گا۔ جو ترقی پذیر و طاقت ور ہو اسی سلسلہ میں اول اول مسلمانوں کو "تفرنج" یا مغربیت کے اختیار کر لینے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ سچ ہے کہ اس دوسرے خیال کے حامیوں کی تعداد ہمیشہ بہت قلیل رہی۔ لیکن تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقے میں اسی کو غلبہ حاصل ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس نے اسلامی آبادی کے افکار و کردار پر بہت کچھ اثر ڈالا جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ فرنگی حکومت کے عمال اور نائبین نے اس گروہ کو دل کھول کے مدد دی۔ اس گروہ کے، مغربیت کی حمایت میں متفق اور سرگرم ہونے کی اصلی علت یہ تھی کہ اس کے اکثر افراد تعلیم کے لئے مغربی ملکوں میں گئے یا ایسے مدرسوں

کے پڑھے ہوئے تھے جنہیں مغربی سلطنتوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں اسلامی ملکوں میں قائم کیا تھا۔ کیونکہ انھیں فکر تھی کہ اسلامی دنیا میں اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ جس طرح ہو سکے مسلمانوں پر اپنا اخلاقی اور تمدنی غلبہ قائم کریں تاکہ مغرب کا سیاسی اور اقتصادی اقتدار مضبوط ہو جائے۔ اس طرح مسلمان تعلیم یافتہ گروہ کی تربیت ایسی آب و ہوا میں ہوئی اور وہ ایک ایسے عالم میں پہنچ گئے جہاں سے مغربیت کی عینک کے سوا وہ اپنے مذہب کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ نہ اس کے متعلق کوئی رائے لگا سکتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان اخلاقی اور تمدنی حقائق کو پوری طرح سمجھنے کے قابل ہی نہ رہے جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ یہانتک بھی نوبت پہنچی کہ انھیں ان اخلاقی اور تمدنی اُصول کی صداقت کا اعتقاد نہ رہا اور وہ ان کو حقارت آمیز بے پروائی سے دیکھنے لگے انکے سخت مخالف اور معاند ہو گئے۔ اس طرح ہمارے یہ نام نہاد راہ نما مغربی رنگ میں رنگے جانے سے اصلی مرض کی طرف سے بالکل اندھے ہو گئے جس کا علاج کرنے چلے تھے اور جس طرح وہ مرض کی نوعیت سے بے خبر تھے اسی طرح اُنھوں نے اس تمدن کے ماخذ معلوم کرنے سے آنکھیں بند کرلیں جس تمدن میں یہ خرابی پیدا ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ کہ ان صاحبوں نے اسلامی دنیا کی حالت کو جو پہلے ہی نازک ہو رہی تھی اور بھی پیچیدہ اور پریشان کن بنا دیا اور لوگوں کے عقاید کو اپنی پسند کے مطابق بنانے کی کوشش میں طبیعتوں کو اور بھی مکدر و متذبذب کر دیا۔

رہے شریعت کے طرفدار تو اُن پر ملاؤں اور مشائخ نے تسلط جما کے غلط راستے پر ڈال دیا تھا اور نفس کشی کے طریقوں سے انھوں نے مسلمانوں کے انحطاط کا تدارک کرنا چاہا اس کا نتیجہ بھی کچھ حسب مراد نہیں نکلا۔ تاہم یہ اعتراف کرنا انصاف کا تقاضا ہے کہ اس گروہ کی بدولت اسلامی دنیا میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت کثیر پیدا ہو گئی جس کا کام ہی یہ تھا کہ علوم شریعت کا مطالعہ اور ان پر غور و بحث کرتی رہے۔ اس نے اپنے دل و دماغ اور فہم و فراست کو انہی علوم کے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے وقف کر دیا اور اسی کا ثمر تھا کہ شرعی تعلیمات کی بنیادوں پر ایک محکم علم

تیار ہو گیا جس میں انسان شریعت کے احکام کو سامنے رکھ کر مشاہدہ، موازنہ اور نتائج کا استنباط کرتا ہے۔ اور جس علم کی غایت یہ ہے کہ ہمیں انسانی زندگی کی تمام ضروریات و لوازم میں شریعت کے مطابق چلنا اور اپنے جملہ افعال کو شریعت کے معیار پر پرکھنا، سکھائے

یہ علم اسلام سے مختص اور فقہ کے نام سے مشہور ہے اور بلاشبہ اخلاقی اور تمدنی علوم کے دائرہ میں انسانی دماغ کی سب سے ممتاز پیداوار ہے۔ اس میدان میں یہ علم اسی قسم کے قواعد و ضوابط مہیا کرتا ہے۔ جیسے کہ علوم تجربی میں ہر شے کی آزمائش و اختیار کے اصول مقرر ہیں۔ مسلمانوں کو اس علم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اسی کے طفیل اسلامی دنیا اپنے مذہب کی روح اور مطمح نظر کو لئے ہوئے صدیوں تک اپنے معتقدات اور اصول و روایات کو محفوظ رکھ سکی۔ حالانکہ اس مدت میں اجانب کے تسلط سے مسلمانوں پر بڑے نازک اور صعب وقت بھی آئے۔ فقہ کا احسان ہے کہ اسلامی دنیا مذہبی اخلاق اور اصول تمدن میں خرابیاں پیدا ہونے سے بچ گئی جن کے پیدا ہونے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔

اسلامی دنیا کے مرض کی، جو اس کے جسم و جان کو کھائے جاتا ہے اور ان اسباب کی جن سے یہ مرض پیدا ہوا۔ تشخیص کرنے کے بعد اس کا علاج معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی بلکہ صاف نظر آنے لگتا ہے کہ مسلمانوں میں جس شے کی کمی ہے وہ علوم تجربی کی تحصیل ہے۔ چونکہ یہ علوم اس وقت مغربی اقوام کے قبضے میں ہیں لہٰذا ان کے حصول کی خاطر ہمیں ان لوگوں کے پاس جانا پڑے گا۔ اور از سر نو وہ تجربی طریقہ جسے ہم بھول گئے ہیں سیکھنا ہوگا اور جدید فنون کا سبق لینا ہوگا جن سے اب تک سخت بے پروائی کرتے رہے۔ مگر یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہو، کہ صرف یہی شے ہے جسے ہم یورپ کی قوموں سے مانگنے جائیں گے کیونکہ گو اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ مسلمانوں کا انحطاط روکنے کے لئے ہمیں مغرب کے تجربی علوم اور صنعتی عملیات سیکھنے ناگزیر ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان معلومات سے کام بھی اسی طریق پر لیں جس طریق سے اہل یورپ نے کام لیا ہے خاص کر سرمایہ اور مزدوری کی تنظیم کے معاملے میں ہمیں ہرگز پیداوار کے ان دو عنصروں

میں وہ تعلق قائم نہ کرنا چاہئے جیسا کہ یورپ میں پایا جاتا ہے۔ عقل کا صریح مقتضٰی یہ ہے کہ اس معاملے میں ہم شریعت پر جمے رہیں۔ یعنی ان قوانین پر جن کی قدر و قیمت بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ اُنھوں نے اسلامی تمدّن کو آبادی کے مختلف طبقات کے باہمی نزاع و فساد سے محفوظ رکھا جیسے کہ یورپ میں آئے دن قومی زندگی کو تلخ کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے اقتصادی نظام کی تشکیل اور درستی اصول فقہ کے ذریعے سے کرنی چاہئے جس کی بنیاد شریعت پر ہے اور جس نے شریعت کے منشا اور مطالب کو پھیلایا ہے۔ اسی میں ہمیں وہ محفوظ قوانین متعارفہ ملیں گے جو نظام تمدن میں بلا خرخشہ عمل کریں۔ اور اسے ان تمام خرابیوں سے پاک رکھیں۔ جو یورپ کے نظام تمدّن کا ناس کرتی رہتی ہیں۔

میرے یہ خیالات تقلید یورپ کے حامیوں کو ضرور ناگوار گزریں گے۔ لیکن وہ اعتراض کیسے ہی شدّ و مد سے کیوں نہ کریں اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ان کے افکار و آرا سے انتہا درجے کی مغرب پسندی کا تو اظہار ہوتا ہے مگر یہ رائیں کسی گہرے مطالعہ پر مبنی نہیں ہیں اور نہ ان صاحبوں نے رائے قائم کرتے وقت فلسفیانہ اُصول کے مطابق پوری تحقیق و توازن سے کام لیا ہے۔ پس پختہ احتمال ہے کہ شاید وہ غلطی پر ہوں۔ یورپی قوموں سے اور خاص کر ان کے طرز تمدّن سے، ان صاحبوں کو جو حسن ظن ہے۔ وہ محض یورپ کی دنیاوی ثروت، و خوشحالی دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ اور اسی طرح اسلامی قوموں کی دنیاوی پستی اور فلاکت دیکھ کر انھیں مسلمانوں کے مجموعی طرز تمدّن بلکہ اسلام کے عام تمدّنی کارنامے سے جو فی الحقیقت قابل ستائش ہے۔ بدظنی ہو گئی ہے۔ وہ از راہ خود نمائی طرح طرح سے ظاہر کرتے ہیں۔ مگر قوموں کی مادّی خوشحالی تو محض اس سرگرمی کا پھل ہے جو وہ صنعتی علوم کے میدان میں دکھاتی ہیں۔ یہ خوشحالی ان کے طرز تمدّن کی بہتری کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ یورپ کے متعلق تو یہ کہنا کچھ غلط نہ ہو گا کہ ان تمدّنی حالات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان تمدّنی خرابیوں کے باوجود وہاں اتنی ثروت و خوش حالی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے "تفرنج پسند" جو یورپ سے اس قدر شیفتگی اور اسلام سے اپنی ناخوشی کا

اظہار فرماتے ہیں۔ یہ ان کی دہری غلطی ہے جس سے ان کا شمار اصول تمدن کے اناڑی اہل الرائے میں ہونا چاہیئے اور جس کی تہ میں دراصل اس قسم کے عیش اور مزے اڑانے کی مقرر خواہش پنہاں ہے۔ جیسے کہ انہوں نے یورپ میں دیکھے اڑائے ہیں۔

مغربی مدنیت یورپ کی موجودہ قوموں کے تمدن پر شروع سے نظر ڈالئے اور ان کی مدنیت کے آغاز اور ارتقار کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اول اول ان میں پیشوایان مذہبی کا تسلط رہا۔ پھر بادشاہی یا دنیاوی اقتدار نے اس کی جگہ لی۔ آگے چل کر دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ وہ حکومت قائم ہوئی جسے غلطی سے جمہوری یا قومی حکومت کا نام دیا گیا ہے اور جس کا وصف امتیازی یہ ہے کہ زمانہ حاضرہ میں تجارت پیشہ فرقہ اس حکومت پر بالکل حاوی اور مسلط ہوگیا ہے۔ یہ فرقہ نہایت محنتی لیکن بلند خیالی کی کمی کے باعث خود غرضی میں مبتلا ہے۔ اور حکومت پر اس کے اقتدار پا جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغربی قوموں کی تازہ ترین ارتقائی منزل میں اقتصادی مسائل نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اور اخلاقی اور تمدنی مسائل پر کافی توجہ نہیں کی جاتی۔ حالانکہ انسان کی حقیقی راحت و مسرت کے اسباب پر نظر رکھئے تو یہ مسائل کہیں زیادہ ضروری اور لائق توجہ ہیں۔ بہرحال اس ردعمل سے مغرب کے جدید تمدن کی خاص نوعیت یہ ہوگئی ہے کہ ہر شخص کے دل میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی تمنا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے پر ابھارتی رہتی ہے جس کے ذریعے سے یہ تمنا پوری ہو۔ نفع کمانے کی دھن ہر شخص کی نفسانیت کو مشتعل کرتی ہے۔ اور اسی نے قابو یافتہ لوگوں کو اتنا سفاک بنا دیا ہے کہ کمال بیدردی سے کمزوروں کا خون چوسیں اور اسباب مسرت یعنی، دولت کی تلاش میں آدمی ہر بات کو جائز سمجھنے لگا ہے۔ دوسری طرف اسی تمدن سے صنعت و حرفت کو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی حتیٰ کہ مغرب کا سارا نظام تمدن ہی اب اس کی صنعت و حرفت کے بل پر قائم ہے۔

ممالک یورپ میں یہ کیفیت طبقہ متوسط کے سرمایہ داروں کی بدولت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کا قیام طبقہ ادنیٰ کی محنت مزدوری کا رہین منت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مغربی تمدن میں مزدوروں نے

سرمایہ داروں سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر قدر و منزلت حاصل کر رہی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ طبقہ ادنیٰ نہ صرف متوسطین (اہل سرمایہ) بلکہ تمام اہل ملک کو اپنی مرضی و رائے کا پابند بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس تمدن کے آئین و شعائر مٹا کر بن پڑے تو اپنے منشاء کے مطابق نئی تنظیم قائم کرے اور اس کا تمام کام مزدور طبقے کے ہاتھ میں ہو۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مغربی ممالک میں اجتماعی زندگی کے عناصر کی حیثیت میں برابر ردوبدل کیا جا رہا ہے۔ اور پیہم تبدیلی کے تجربوں کی ضرورت کسی طرح پوری نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مغربی ملکوں کا تمدنی ارتقاء اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے مشابہ ہے کہ ناواقفیت میں کبھی کسی طرف نکل گئے، کبھی کسی طرف اور اناڑی پن کے ان تجربوں میں صرف وقتی ضروریات، ہنگامی حالات اور تعصبات ان کی رہنمائی کرتے رہے مگر یہ نتیجہ درست ہے تو اس کا کھلا ہوا سبب یہ ہے کہ مغربی ملکوں نے کبھی تمدن کا کوئی مستقل مطمح نظر سامنے رکھنے کی فکر نہیں کی۔ جذبات میں تغیر اور مادی ضروریات اور عملی علوم کے ساتھ ساتھ ان کے منشائے تمدن میں برابر تبدیلی ہوتی رہی[5]۔ اور بجائے اس کے کہ یہ منشاء یا یوں کہو کہ مناشی ان کے ارتقاء کی رہنمائی کرتے الٹے اس کے ماتحت اور پیرو ہو گئے۔ لیکن اگر تمدن کا مطمح نظر یا منشا مقرر و معین نہیں ہے اور اگر حوادث و واقعات کے اثر سے وہ ہر گھڑی بدلتا رہتا ہے اور تمدنی ارتقا کی رہبری کرنے کی بجائے خود اسی کا تابع ہو گیا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مطمح نظر ہی ناقص اور نکما ہے اور فطرت کے ان تمدنی اور اخلاقی حقائق پر مبنی نہیں ہے جو انسان کے ارادہ و رائے سے ماوریٰ ہیں۔ اور اپنے کام اور فائدہ مندی سے انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ ان (حقائق) کا احترام کرے۔ اس کے برخلاف یہ مطمح نظر محض فلاں فلاں اشخاص مقتدر کی ذاتی رائے پر اور ترنگ میں آ کے انہوں نے جو فیصلہ کر دیا۔ اسی پر مبنی ہے۔ نظر بریں ثابت ہے کہ مغربی دنیا نے ابھی تک اخلاق و تمدن کے

---

[5] جو تجربہ وہاں ناکام ہو جاتا ہے اسے غلام آباد ہند۔ چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اٹھا کر چوسنے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کی قومیت پرستی (NATIONALISM) بھی اسی قسم کی نقالی کا نتیجہ ہے۔ جسے مسلم "قومیت پرست" عین اسلام قرار دے رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

صحیح اصول نہیں سیکھے ہیں یعنی وہ اصول جن کی بنیاد فطرت کے ازلی قوانین پر ہے اور جو انسان کی اجتماعی زندگی محکم و مستقیم رکھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ استقامت سے یہاں وہ توازن مراد ہے جس کے بغیر ہر تمدنی مسرت ناپائدار اور ناتمام رہے گی۔

نظام تمدن کا غیر مستقیم ہونا اس بات کا صریحی ثبوت ہے۔ کہ اس تمدن نے قوم کے صرف ایک حصے کو رضامند اور باقی حصوں کو ناراض و نامطمئن کر رکھا ہے۔ اور اس سے ایک کی بیجا پاسداری اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نظام تمدن جس قدر غیر مستقل اور نامستقیم ہے۔ اسی قدر وہ نامنصفانہ ہوگا۔ اور اس کی زیادہ شدت سے مخالفت کی جائے گی۔ وہ محض جبر و تعدی سے اپنے آپ کو قائم رکھ سکے گا اور انجام کار یہی ظلم و جور جو اسے اپنی بقا کے واسطے اختیار کرنے پڑے۔ اس کو تباہ و برباد کر دیں گے مغربی ملکوں میں حکومت کے ساتھ جو بلا وقفہ و سکون مسلسل جنگ ٹھنی رہتی ہے (حالانکہ حکومت انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے ناگزیر ہے) اس کا راز یہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی ممالک کو دیکھئے تو فرق عظیم نظر آئے گا کہ یہاں حکومت دلوں میں کامل اطمینان و احترام پیدا کرنے کے باعث غیر متزلزل ہے۔

مغرب میں بادشاہی کی حکومت ہو یا کلیسا کی دنیا دار غالب ہوں یا مذہبی پیشوا عمائد و اکابر قوم کا دور دورہ ہو یا جمہوری عوام کا خواہ سرمایہ داروں کی جگہ اشتراکیت لے لے۔ خرابی وہی رہے گی۔ اگرچہ اس کی شکلیں اور لباس دوسرا ہوگا۔ سابقہ بدعنوانیوں کی بجائے نئی بدعنوانیاں اور تازہ حق تلفیاں ظہور میں آئیں گی۔ اور اپنی نوبت پر اس قسم کی برائیاں پیدا کر دیں گی جن کا خمیازہ آئندہ نسلوں کو بھگتنا پڑیگا اسی لئے قوم ایک وقت خاص میں کتنی ہی ثروت و قوت اور مادی آسودگی سے بہرہ مند ہو۔ اس کی خوش دلی محض عارضی اور ادھوری ہوگی، کیونکہ دلوں کو پورا چین نصیب نہ ہوگا۔ اور اس کا نظام تمدن استقامت و پائداری سے محروم ہوگا۔ کوئی بتائے کہ یہ حالت کس طرح لائق آرزو اور قابل رشک ہو سکتی ہے؟

ہمارے تعلیم یافتہ "ارباب فکر" میں منجملہ دوسرے توہمات کے ایک یہ خطرناک اور باطل خیال بھی

جس کی تردید خاص طور پر ضروری ہے پھیل گیا ہے۔ کہ مغربی ممالک میں آدمی اس قدر آزادی سے بہرہ یاب ہے جو آج تک کبھی انسان کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ درحقیقت خواہ کوئی ملک و قوم ہو۔ آزادی اور مساوات کی مقدار ہمیشہ تمدنی توازن کی استقامت کے متناسب ہوا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس قدر کسی ملک میں عدل و حق رسی زیادہ ہے۔ اسی قدر وہاں زیادہ آزادی اور مساوات ہوگی۔ اب اگر مغربی قوموں کے مختلف طبقوں میں عداوت و رقابت کا ایسا زور پایا جاتا ہے کہ وہ وحشیانہ شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے لڑنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ جس کا ہمیں آئے دن مشاہدہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے ایک طبقے کے افراد کی باہمی پیوستگی اور قوت کی بقایا **قوم کے بہ حیثیت مجموعی** نقصان میں رہنے پر منحصر ہے اور مختصر یہ کہ اگر ان کے تمدن کا توازن برابر ٹوٹتا یا خطرے میں پڑتا رہتا ہے۔ تو یہ قطعی ثبوت ہے کہ ان قوموں میں آزادی اور مساوات ایسی کامل حالت میں نہیں ہے۔ جیسی کہ ہمارے تعلیم یافتہ اہل الرائے سمجھے بیٹھے ہیں۔

مزید براں مغربی ملکوں کی طرح جو تمدن مذکورہ بالا اصول کی عدمیت پر مبنی ہو۔ اس میں حقیقی آزادی اور مساوات کی چول بٹھانی بہت مشکل ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ افراد اور خاص خاص جماعات دونوں کے حق میں بیجا امتیازات و پاسداری پر مغرب کے نظام تمدن کی جڑیں قائم ہوئی ہیں۔ ایسے تمدن میں نام نہاد آزاد خیالی کے قوانین نافذ کرنے کی کیسی ہی شیخیاں بگھاری جائیں۔ صدیوں کے تعصبات طبائع کو آزادی اور مساوات سے بعید و بیگانہ کر چکے ہیں۔ لہذا عمل میں برابر ناانصافی موجود رہے گی۔ اس خرابی کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں نظر آتا۔ کہ نسل ہا نسل تک صبر و دور اندیشی کے ساتھ مناسب حال نظام تعلیم پر عمل درآمد کیا جائے۔ اور بتدریج لوگوں کی ذہنیت کو بدل دیا جائے۔ ذات پات اور نسل و خاندان کے بیجا امتیازات مغربی ملکوں سے صرف اس وقت دور ہو سکتے ہیں جبکہ عدل و رواداری کا جذبہ لوگوں کے دل و دماغ میں سرایت کر جائے اور وہ ایک دوسرے کو بالکل مساوی سمجھنے لگیں، خواہ کسی کی اصل نسل اور دنیاوی مرتبہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو کچھ امتیاز رہے اس کی بنا محض افراد کی یہ ذاتی قابلیت ہو۔ کہ وہ اپنے فرائض کو کس طرح ادا کرتے

اور اپنے حقوق سے کیوں کر کام لیتے ہیں ۔

مذکورہ بالا لوازم کے بغیر آدمی آزادی و مساوات کا نہ صحیح تصور قائم کرسکتا ہے اور نہ اپنی ضرورت کے مطابق پوری طرح ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکتا ہے ۔ دراصل اسے سب سے پہلے جو چیز سمجھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ کسی خاص قوم میں جو آزادی اور مساوات موجود ہے اس کی قدر و قیمت اتنی ہی ہوگی جتنی اس قوم کے افراد کے اخلاق اور تمدنی قابلیت کی قیمت ہے۔ اور خود افراد کی یہ اخلاقی اور تمدنی قابلیت قوم کے اخلاقی اور تمدنی اصول پر منحصر ہوگی نا کہ ان وقتاً فوقتاً نافذ ہونے والے قوانین پر جو یہ قوم اس غرض سے جاری کرے کہ اس میں عدم رواداری اور بیجا پاسداری کے باعث جو طرح طرح کی ناانصافیاں ہوتی چلی آتی ہیں ۔ وہ دور کی جائیں یہ قوانین کم و بیش منصفانہ بھی ہوں تو بھی ظاہر ہے کہ اصلی مرض کا علاج نہیں ہوسکتا غرض جب تک اہل مغرب کی طبائع کو بالکلیہ نہ بدل دیا جائے ۔ اس وقت تک مختلف طبقات آبادی کی باہمی کشمکش دور نہیں ہوسکتی ، جو سیاسی تبدیلیوں کے باوجود جن کا منشاء اس کشمکش سے ملک کو نجات دلانا تھا ، برابر جاری ہے ۔ آزادی اور مساوات کی ساری تمنائیں ، تمدنی بہتری کے وہ سارے دعاوی جو روزانہ کم و بیش تعدی کے ساتھ منوائے جاتے ہیں اور کبھی ان کی تشفی نہیں ہوتی ، طبائع یا ذہنیت کی اسی مذکورہ بالا تبدیلی سے پورے ہوسکتے ہیں ۔ اور اسی وقت یورپ تمدنی انصاف حاصل کرسکتا ہے جس کے لئے وہ اتنی مدت دراز سے بیکار ایڑیاں رگڑتا تھا ۔

ان مختلف مشاہدات اور موازنوں سے جو میں نے پیش کئے جو نتیجہ نکلتا ہے ، وہ میں بے تکلف بیان کئے دیتا ہوں کہ مسلم اقوام کو کچھ ضرورت نہیں ہے کہ یورپ کے اخلاقی اور تمدنی اصول کو شریعت پر ترجیح دیں۔ شریعت کے قوانین ان مغربی اصول پر ہر طرح بدیہی فوقیت رکھتے ہیں اور اسلامی دنیا کے موجودہ انحطاط کو دور کرنے کے لئے شریعت سے روگردانی کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان شریعت کے قوانین کو زیادہ اچھی طرح سمجھیں اور زیادہ اچھی طرح ان پر عمل کریں ۔

مغرب کا سیاسی نظام

تمام سیاسی نظامات کی طرح ممالک مغرب کے سیاسی نظام بھی وہاں کے تمدنوں سے پیدا ہوئے ہیں کہ جو قومیں ان ملکوں میں آباد ہیں ان کے

کام آئیں اور ان کے ارتقا میں مدد دیں پس جب یورپ کا نظام تمدن آگے چل کر بدلے گا تو اس کے سیاسی نظام بھی لازماً بدل جائیں گے اور یہ امر انہیں خواہ مخواہ ایسا ہی ناپائدار اور تغیر پذیر بنا دے گا جیسا کہ وہ تمدن ہے جس سے یہ سیاسی نظام پیدا ہوئے ہیں۔

مجھے اس وقت اُن مراحل سے سروکار نہیں جن سے مغرب کے سیاسی نظام دور گذشتہ میں گذرے ہیں۔ صرف زمانہ حال کے نظام کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ کلیتہً قوم کی فرماں روائی کے اصول پر مبنی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ مغربی قوموں کو سوائے قوم کی رائے کے جو بلا روک ظاہر کی جائے اور کوئی ذریعہ اہل ملک میں حق اور انصاف سے کام لئے جانے کا میسر ہی نہیں آیا۔ اور مزید معلومات یا تجربہ حاصل ہونے تک یورپ کی یہی کیفیت رہے گی۔ اسی اصول کے اختیار کرنے کا نتیجہ تھا کہ **قومی نیابت** کی بنیاد پڑی اور قومی نیابت کا آئین ہی مغربی تمدن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اب، چونکہ مغربی قومیں، معاشرت کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں اور یہ طبقے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ اکثر اوقات مخالف منشاء اور آرزوئیں رکھتے ہیں کیونکہ انکی تمدنی ضرورتیں بالکل مختلف ہیں، لہذا شروع ہی سے **قومی نیابت** مخالف جماعتوں کی کشمکش کا اکھاڑا بن جاتی ہے۔ الگ الگ فرقے تیار ہوتے ہیں اور یہ سیاسی فرقے اگرچہ محض اپنے اپنے طبقات کی اغراض و مفاد کے جویا اور دلدادہ ہوتے ہیں تاہم دعوے یہی کئے جاتے ہیں کہ ہم ساری قوم کی بہتری میں ساعی ہیں۔ اس طرح یورپ کی مجالس ملکی (یا پارلیمنٹیں) مختلف طبقاتِ آبادی کی زور آزمائیوں کا دنگل بن گئی ہیں اور کبھی ایک سیاسی فرقے کو کبھی دوسرے کو یہ موقع بہم پہنچاتی رہتی ہیں کہ وہ حکومت پر قبضہ کرلے اور جب تک اس کا زور چلے صرف اپنے فرقے کا بھلا کرتے رہے۔ یہ ہے وہ خدمت جو قومی نیابت یورپ میں آج کل انجام دے رہی ہے۔ اور یہ جنگ اس وقت تک برابر ٹھنی رہے گی جب تک کہ مختلف طبقات میں عناد و رقابت موجود ہے۔ حقیقت میں مغربی قوموں کو اپنی سیاسیات میں امن اور باہمی اعتماد کی نعمت اس وقت میسر آئے گی۔ جبکہ وہ اپنے تمدنی فساد اور عناد سے نجات حاصل کرلیں اسی کے ساتھ انصافاً یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ مغربی قوموں نے اپنے لئے جو سیاسی نظام مرتب کرلیا ہے۔

وہ ان کے تمدنی نظام سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور اس تمدن کی ضرورتوں کو بخوبی پورا کر سکتا ہے۔

قومی نیابت، قوی فرماں روائی کے عقیدے پر مبنی ہے اور جس طرح قومی فرمانروائی کو مطلق العنان منزہ عن الخطا اور قوت قاہرہ مان لیا گیا ہے اسی طرح اس کی آفریدہ **قومی نیابت** کے حقوق و اختیارات بھی بہت زیادہ وسیع ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ان اختیارات کی کوئی حد ہی نہیں۔ کیونکہ یہ قومی نیابت، وضع قوانین کا اجارہ رکھتی ہے یعنی صرف اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ قوم کی منشا کا اظہار کرے اور قوانین کی صورت میں قوم کو اس منشا کا پابند بنائے۔ انتظامی یا عاملانہ اختیارات پر بھی، جو بعض ملکوں میں اقتدار کامل کی شان رکھتے ہیں یہی قومی نیابت نگرانی کرتی ہے۔

قومی نیابت کا سب سے بڑا کام ملک میں جمہوریت کو مسلط کرنا ہے اور اس جمہوریت کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ قلت تعداد کو اکثریت کی مرضی کا محکوم بنایا جائے اور ادھر قومی نائبین یا مبعوثین کو ملک پر نگرانی رکھنے کا جو اختیار دیا گیا ہے وہ نظم و نسق میں عقل و دیانت سے کام کرنے کی بجائے مبعوثین کی ذاتی اغراض میں صرف ہوتا ہے۔ **جماعت عاملہ** مبعوثین انتظامی جماعت کے ہاتھ میں موم کی ناک بن جاتی ہے، اور چونکہ ہر قوت، جو آزادی سے محروم ہو جائے اپنی خصوصیت کھو بیٹھتی ہے اور اپنا اصلی اور طبعی کام انجام دینے کے قابل نہیں رہتی۔ لہٰذا مذکورۂ بالا جماعت عاملہ بھی اپنے اصلی مرتبے سے تنزل کر کے بالآخر محض ان اشخاص یا فرقوں کی ذاتی اغراض پوری کرنے کا آلہ بن جاتی ہے جو مجلس مبعوثین میں اس کا آسرا بنے ہوئے ہیں وہ عمدہ اور بڑی بڑی تنخواہوں کے عہدے ایجاد کرتی اور اس طرح بانٹتی ہے کہ اس کے سرپرستوں کے لئے اور مددگار پیدا ہو جائیں اور انتخابات کے موقع پر ہر ممکن ذریعے سے کوشش کرتی ہے کہ اس کے سرپرستوں اور حامیوں کی تعداد غالب رہے۔ وہ ہر قسم کی بیجا رعایت یا مصالحت پر رضامند ہو جاتی ہے اور نہ صرف نظم و نسق کو پھیلاتی اور گرانبار بناتی ہے بلکہ اس میں فساد و خرابی پیدا کرتی ہے غرض اس قسم کے سیاسی نظام میں جماعت عاملہ یا حکومت اچھا نظم و نسق کرنے کے بجائے زیادہ تر بدنما ساز و باز میں مصروف رہتی ہے، اس کے علاوہ وہ سیاسی نظام جس میں وضع قوانین کا حق، کسی ایک سیاسی فرقے کی مٹھی میں آجائے ہمیشہ ناقص اور نامناسب

ہوتا ہے کیونکہ وہ فرقہ صریحاً خود رائے اور عدل و انصاف کی طرف سے غافل ہوگا اور قانون سازی گویا حقیقت میں جور و جبر کا محض ایک آئینی ہتھیار بن جائے گی۔ شخصی مفاد یا فرقے کی اغراض کو پیش نظر رکھکر قوانین وضع کئے جائیں گے اور وسیع و صحیح معنی میں ساری قوم کے فائدے کا پورا لحاظ نہیں رکھا جائے گا ان قوانین میں خواہ مخواہ ناانصافی اور بیجا رعایت کا دخل ہوگا۔ جب تم غور کروگے کہ وہ سیاسی جماعت جو قوانین وضع کر رہی ہے اس کے افراد میں شخصی جذبات اور باہمی رقابت کا زور ہے اور اسی لئے اعتدال و دور اندیشی کی کمی ہے۔ تو تم آسانی سے اندازہ کرلوگے کہ ایسی جماعت کے وضع کردہ قوانین کی کیا خاک وقعت باقی رہے گی۔ لطف یہ ہے کہ اس قسم کی سیاسی تنظیم کے ماتحت جو قومیں زندگی بسر کر رہی ہیں، وہ انتہائی کوشش کرتی ہیں کہ قانون سے کام لینے والے، عدالت کے حکام ہر طرح کے برے اثرات سے آزاد اور محفوظ رہیں۔ تاکہ قانون کی تعبیر و استعمال میں کوئی ناانصافی ہونے نہ پائے۔ لیکن اگر یہ قومیں اس بات کو جانتی ہیں کہ قانون سے کام لینے میں جیسی انصاف پسندی اور اعلیٰ علمی قابلیت درکار ہے اس سے بھی زیادہ انصاف پسندی اور فضیلت قانون وضع کرنے کے واسطے ہونی چاہیئے، تو صاف ظاہر ہے کہ خود ان قوموں کو اپنے سیاسی نظام کے بدیہی نقائص اور خامیوں کا اعتراف ہوگا۔

یورپ کے سیاسی نظام کے استقام و مفاسد کے بیان کو طول دینا تضیع اوقات ہے کیونکہ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مگر صرف یہی حقیقت جو اوپر بیان ہوئی اس نظام کو مردود کرنے کے لئے کافی ہے اور یہ قومی فرماں روائی کے اصول کا نہایت اہم، نہایت سنگین اور بالکل بلاواسطہ نتیجہ ہے۔ لیکن اس نظام کی خرابیاں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں، میں مکرر اقرار کرتا ہوں کہ یہ سیاسی نظام اتنی خوبی ضرور رکھتا ہے کہ جس طرز تمدن کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور اس کا سچا مظہر ہے۔ اس سے پوری مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے وہ اگر ناقص ہے تو اس لئے کہ وہ ایسے تمدن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مرتب ہوا ہے جو بذات خود ناقص ہے اس میں لے دے کے کوئی خوبی نظر آتی ہے تو وہ یہی ہے۔ اور ہر چند وہ جیسا کچھ بھی ہے ہم اس کی تذلیل و تحقیر نہیں کرتے لیکن یہ تو

صاف ظاہر ہے کہ ایسی قوم کے حق میں جس کی ضرورتیں مغربی اقوام کی ضرورتوں سے مختلف ہوں، یہ نظام سخت نقصان رساں ہوگا۔[1] دوسرے فی الواقع اسے اختیار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی ہم میں سے جو لوگ اس یورپی نظام کے حامی ہیں وہ بظاہر اس لئے کہ مغرب کا سیاسی نظام جس تمدن کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اس کے ہر طرح مناسب حال ہے اس کے مداح و معترف بن گئے ہیں؛ اگرچہ اصلی وجہ کی خود انھیں خبر نہ ہو لیکن حقیقت میں مغرب کے سیاسی نظام سے اُن کی شیفتگی کی علت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مرض جس سے اسلامی دنیا آزار پا رہی ہے قوانین طبیعی سے مسلمانوں کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ جہالت انھیں فطرت کی نعمتوں سے محروم اور دنیاوی عُسرت و افلاس میں مبتلا رکھتی ہے۔ اور ان کی سیاسی آزادی کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے اس کے مقابلہ میں وہ مرض جو مغربی دنیا کو لاحق ہے۔ اخلاق و تمدن کے طبیعی قوانین کی جہالت سے پیدا ہوا ہے اور یہ جہالت اہل یورپ کو دائماً تمدنی تپ میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس طرح اسلامی دنیا مادی خوش حالی سے محروم ہے۔ اور آخرالذکر (یعنی مغربی دنیا) تمدنی آسودگی سے بے بہرہ ہے۔

اس مرض سے نجات پانے کے لئے اسلامی دنیا کو لازم ہے کہ اس جہالت کا ازالہ کرے، جو بیماری کی اصلی جڑ ہے۔ اس ازالہ کے لئے مسلمانوں کو خواہ مخواہ مغربی ممالک سے مدد لینی ہوگی۔ جو اس معاملہ میں خوش نصیب ہیں اور علوم طبیعی پر اُن کا قبضہ ہے۔ دوسری طرف اگر مغربی ممالک اپنے روگ کا علاج کرنا چاہتے ہیں تو اس کی بہترین سبیل یہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا سے دستگیری چاہیں اور اخلاق و تمدن کے وہ قوانین مستعار لیں جن پر اسلامی شریعت مشتمل ہے۔

---

[1] اس لئے مسلمانانِ ہند یورپ کے وضع کردہ نظام جمہوری کو اپنے لئے ناقابل قبول سمجھتے ہیں لیکن چونکہ یہ چیز ہندوؤں کے مفاد کے خلاف جاتی ہے اس لئے وہ مسلمانوں کی اس مخالفت کو انگریز پرستی اور آزادی دشمنی وغیرہ کے لیبل لگا کر انھیں بدنام کرنے کی ناپاک کوششیں کرتے ہیں اور اپنے ساتھ چند نام نہاد مسلمانوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

الغرض، اسلامی دنیا کو یورپ سے جو امداد و اعانت حاصل کرنی ضروری ہے وہ بالکل خاص اور محدود قسم کی ہے۔ وہ امداد ہرگز تمدنی اور سیاسی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اسلامی ممالک کو مغربی رنگ میں رنگنا، خواہ کسی پیرائے میں اور کسی حد تک کیوں نہ ہو، ایسی غلطی ہوگی جس سے بدتر غلطی خیال میں نہیں آتی۔

مُسلمانوں کا سیاسی نظام بہترین سیاسی نظام وہ ہے جو کسی قوم کے طرزِ تمدن کے بالکل موافق ہو اُس تمدن کے اصول کی عملاً بالکل صحیح تعبیر کرے اور ان اصول کو بے کم و کاست ظہور میں لائے، اس قاعدہ کُلّیہ کو سامنے رکھ کر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کا بہترین سیاسی نظام کیا ہونا چاہیئے [۱]

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلامی ملک یا تمدن وہ ہے جو شریعت کی فرمانروائی کے ماتحت ہو۔ بالفاظ دیگر یہ وہ تمدن ہے جس میں ہر شخص شریعت کے اخلاقی اور تمدنی احکام کی انفراداً پابندی کرتا ہے اور اسی کے ساتھ لحاظ رکھتا ہے کہ دوسرے لوگ یعنی پوری قوم بحیثیت مجموعی، ان احکام کی پابندی اور احترام کرے۔ یہی ہر مسلمان کا وہ اسلامی فرض ہے جس سے لازمی طور پر ایک ناقابلِ انکار حق وجود میں آتا ہے اور وہ حق حکومت پر نگرانی رکھنا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا آئین حکومت لازماً جمہوری یا نیابتی ہوگا۔

لیکن اسلامی ملک میں آبادی کے طبقات باہم رقیب و معاند نہیں ہوتے اور لوگوں کا منشا اور تمدنی مقاصد یکساں ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس ملک میں قومی نیابت کی شکل مغربی ممالک سے مختلف

---

[۱] اسی کلیّہ کے پیشِ نظر مسلمانانِ ہند اپنی اکثریت کے علاقوں میں ایسا سیاسی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے طرزِ تمدن کے بالکل موافق ہو۔ اسی اسکیم کا نام "علیحدگی کی اسکیم" یا نظریۂ پاکستان ہے۔ لیکن چونکہ ہندو تمام ملک میں پراچین کا تمدن نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کی اسکیم کی سرتوڑ مخالفت کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام"

ہوگی اور جس طرح اُس کی تشکیل اور حقوق و امتیازات دوسرے ہوں گے اسی طرح اس کی غایت اور مقصود میں بھی یورپ کے مُلکوں سے فرق ہوگا۔ اسلامی ممالک میں قومی نیابت کی خدمت ایک مجلس انجام دے گی جس کے ارکان کو قوم نے منتخب کیا ہو۔ مگر اس مجلس کے اجزاء ترکیبی لازمی طور پر ایسے ہوں گے جو کامل صلح و ہم آہنگی سے کام کر سکیں۔ یہ صلح و آشتی۔ مختلف طبقوں کی اسی اُخوت پر مبنی ہوگی۔ جو ملت اسلامی کی ایک ممتاز خصوصیت ہے مجلس ملکی میں آشتی کا دور دورہ ہوگا، اور یہ سیاسی میدان میں بھی اُسی اتحاد و پیوستگی کو برقرار رکھے گی جو ہمارے تمدنی حلقے میں پایا جاتا ہے۔

اس طرح اسلامی پارلیمنٹ میں اشتراکی، مزدکی (کمیونسٹ) جمہوری یا بادشاہی پسند فرقوں کا کوئی وجود نہ ہوگا بلکہ صرف ایسے نیک نیت اشخاص جمع ہوں گے جن سب کا مقصد اور مطمح نظر ایک ہے۔ یعنی مقدور بھر شریعت کے عاقلانہ احکام کی صحیح تعبیر و تطبیق کرنا ان لوگوں کا اختلاف جو کچھ ہوگا وہ ایک مشترک مقصد کے حصول کے وسائل منتخب کرنے میں ہوگا اسی لئے اسلامی ملک کے وکلاء یا مبعوثین کو ایک دوسرے پر فتح و غلبہ حاصل کرنے کے واسطے زور آزمائی کی ضرورت نہ ہوگی وہ صرف ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے اور سب مل کر ایک مشترک مقصد کی پیروی کریں گے رقابت باہمی سے بری ہونے کے باعث حکومت پر اُن کی نگرانی میں رورعایت، طیش و غضب یا نفرت و حسد کا کوئی عنصر نہ ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اُن کی نگرانی ایسے اسباب کے ماتحت عمل میں آئے گی جن سے انسانی کوششیں نہایت مفید و بارور ہو سکتی ہیں۔

اس پارلیمنٹ کے حقوق و اختیارات بے شبہ اتنے وسیع ہوں گے کہ وہ حکومت عاملہ پر نہایت جزئی، نہایت مکمل اور نہایت کارگر نگرانی رکھے۔ لیکن اس پارلیمنٹ کو وضع قوانین کا منصب حاصل نہ ہوگا۔ سیاسی یا مُلکی مبعوثین کو یہ حق تفویض کرنا منشاءِ شریعت کے موافق نہیں ہے کیونکہ شریعت کے احکام کی کامل دانشمندی اور عدل گستری اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتی کہ محض سیاسی اشخاص کا گروہ، خواہ وہ کیسے ہی اعلیٰ اوصاف سے متصف ہوں۔ وضع قوانین کے منصب سے سرافراز کیا جائے دوسرے وہ اسباب خاص جن کی بدولت مغربی ملکوں میں یہ حق پارلیمنٹ کو دیا جاتا ہے، اسلامی

قوم میں وجود نہیں رکھتے، اسلامی پارلیمنٹ کو نہ تمدنی انقلابات سے سابقہ ہوگا نہ ملک کی ایسی نت نئی ضرورتوں کے مطابق قانون بنانے میں وقت صرف کرنا پڑے گا جو یورپ کی قوموں میں تمدن کی ناپائداری اور تغیر پذیری کے باعث رونما ہوتی رہتی ہیں۔ غرض اسلامی ملک میں قوم کی نیابتی مجلس وضع قوانین کا اختیار رکھنے والی جماعت نہ ہوگی بلکہ اسے نظم ونسق پر نگرانی کا حق حاصل ہوگا اُس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ قوم پر دیانت اور دانشمندی کے ساتھ حکومت کی جائے اور لوگوں کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، کامل انصاف اور حق رسی کا برتاؤ کیا جائے اور اس طرح قوم کے نشوونما پانے میں مدد اور تقویت پہنچائی جائے۔

وضع قوانین کا حق

چونکہ اسلامی قوم کے لئے قوانین وضع کرنے کا کام درحقیقت نہایت اہم تمدنی کام ہے اور مغربی اقوام کی طرح یہاں اس کام میں سیاسی اغراض کا عنصر غالب نہیں ہے۔ لہٰذا قانون سازی کا حق[1] اسی شخص کو ملنا واجب ہے جو قانون وضع کرنے جانتا ہو۔ یعنی فقیہ ہو کیونکہ یہاں قلت واکثریت کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ محض قابلیت کا سوال ہے۔ اگر محض قابلیت یا فن کی مہارت سے ایک طبیب کو یہ حق مسلمہ طور پر حاصل ہے کہ لوگوں کی صحت کی نگرانی اسی کے سپرد کی جائے تو ساری قوم کی اخلاقی اور تمدنی صحت کی نگرانی تو لامحالہ اس بات کی کہیں زیادہ مستحق ہے کہ اس کا حق صرف صاحب مہارت یا ایسے شخص کے تفویض کیا جائے جو اس کی خاص قابلیت رکھتا ہے، فقط قابلیت ہی اس منصب کی شرط ہونی چاہئے اس طرح مذکورہ بالا حق کی تفویض کے بارے میں جو قضیے پیش آتے ہیں اُن کا بالکل سدِ باب ہوجائیگا وضع قوانین کا منصب جس قدر زیادہ عالی ہے۔ اسی قدر زیادہ ضروری ہے کہ جو شخص اس پر سرفراز کیا جائے وہ اپنی قابلیت میں خاص طور پر ممتاز اور ہر طرح دوسروں سے فائق ہو۔ ظاہر ہے کہ ہمارے واضع قانون کو علوم شریعت میں پورا تبحر ہونا چاہیے جس کے بغیر فن کی مہارت حاصل

---

[1] یعنی شریعت کے اصولی اور ناقابل تغیر احکام کی روشنی میں قرعی اور جزئی ہنگامی اور وقتی مسائل کے متعلق قوانین (Byelaws) مرتب و مدون کرنے کا فریضہ۔ "طلوع اسلام"

نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ اسے اعلیٰ درجے کے اخلاقی اوصاف۔ اعتدال پسندی، عاقبت اندیشی، عدل، اصابت رائے غرض صحیح معنی میں حکمت و دانش سے بہرہ مند ہونا چاہئے۔ ضرور ہے کہ وہ نفسیات کا ماہر، قوم کا نبض شناس اور لوگوں کی خوخصلت سے بہت اچھی طرح واقف ہو، یہی اوصاف ہیں جو کسی واضع قانون میں ہوں تو وہ زندہ قوانین بنا سکتا ہے۔ یعنی ایسے قانون جو محبوب و محترم بھی ہوں اور اس کے ساتھ لوگوں پر اُن کا خوف و رعب بھی طاری رہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر جو قانون بنائے جائیں گے اُن کی حیثیت قوم کی نظر میں کوتوالی کے ضابطوں کی سی ہوگی۔

وضع قوانین کا حق صرف فقہا (Jurists) کو ملنا چاہئے۔ یعنی ماہرین کی اس جماعت کو جو علوم شریعت کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہتی ہے۔ مگر یہ بات لازمی ہے کہ ان فقہاء کا علم عمل صالح اور تقویٰ سے آراستہ ہو تاکہ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت و توقیر قائم کرسکیں اور جو قوانین بنائیں وہ قوم میں رتبہ قبول پائیں، بہرحال قوم کا کام ہوگا کہ اپنی ملکی مجلس کے ممبوئین کی طرح اپنی تشریعی مجلس بھی ایسی انتخاب کرے، جو آزاد اور بالکل بے لوث ہو اور پارلیمنٹ کی طرح اس کا مقصد بھی یہ ہو کہ شریعت کی حکومت قاہرہ کو قوت پہنچائے۔

اس تدبیر سے اسلامی تشریع کی عمارت انہی تیرہ سو سال کے آثار قدیمہ پر قائم رہے گی جو عدل و دانش کی صفات سے متصف ہیں اور حیرت انگیز کامیابی سے زمانے کی ساری کھکیڑیں جھیل چکے ہیں۔ اس طرح اسلامی تمدن نہایت پائدار، منتظم اور ترقی پذیر رہے گا۔ اسلامی تہذیب و شعائر ناگہانی رد و بدل سے محفوظ ہو جائیں گے اور اپنی فطرت کے مناسب ایسے طریقوں سے نشو و نما پائیں گے جن کی صحت، معقولیت اور باہمی مناسبت کو خوب سوچ بچار کر انھیں اختیار کیا گیا ہوگا۔

صدر حکومت

اسلامی مملکت میں حکومت کا ماخذ شریعت ہے۔ بلکہ حکومت محض شریعت کا لازمہ اور اس کی خادم و پاسبان ہے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اسے قوی اور

وسیع الاختیار ہونا چاہئے تاکہ شریعت سے جس قدر فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ان کی پوری طرح کفیل ہو۔ حکومت کیسی ہی نیک نیت اور قوم کی بہی خواہ کیوں نہ ہو۔ اگر قوت و اقتدار نہیں رکھتی تو زمین شور کی مثل ہے۔ جس میں کوئی پھل نہیں۔ اسلامی ملک میں حکومت کے پاس لازمی طور پر تمام ایسے اخلاقی، مادی اور تمدنی وسائل مہیا ہونے چاہئیں جو اس کے خاطر خواہ اور دیرپا کام کرنے کے لئے درکار ہیں۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے اسلامی اصول کو جو بُعد ہے، اس کا یوں اندازہ کیجئے کہ اسلامی ملکوں میں حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ مذہب اور شعائرِ مذہب کا تحفظ کرے اور انھیں اندرونی فتنوں اور بیرونی حملوں سے بچائے، دوسرے ملکوں کی بہ نسبت اسلامی ملکوں میں حکومت کا قوی و مضبوط ہونا زیادہ ضروری ہے۔ اور یہ بیان کرنے میں کسی تفصیل و دلیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت کے قوی اور کارگر ہونے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ اس کی باگ شخص واحد کے ہاتھ میں ہو۔ اور دوسری اتنی ہی ضروری شرط یہ ہے کہ صاحب حکومت کو قوم منتخب کرے۔ یہ قوم کا قطعی طور پر مسلّمہ حق ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ ملک کے نظم و نسق کے ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی نگرانی رکھے۔ اور نظم و نسق درست نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ حکومت کی عنان قابل ترین شخص کے ہاتھ میں نہ ہو۔ لہٰذا نظم و نسق کی نگرانی کا فرض انجام دینے کے لئے قوم کو یہ حق حاصل ہو کہ حاکم کا خود انتخاب کرے۔

لیکن معاملات ملک داری میں کسی حق کا حاصل ہونا اور اس سے کام لینا دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں جس شخص کو کامل اختیارات دئے جائیں گے۔ اس کی حکومت میں اصولاً کوئی دوسرا شریک و حریف نہیں ہو سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ یہ شخص جب تک کہ دوسروں کو اپنے بعض اختیارات تفویض نہ کرے اپنے حق حکمرانی سے کام نہیں لے سکتا۔ بے شبہ یہ تفویض خود اس کی رضامندی سے ہوگی۔ لیکن بہرحال اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے اعلیٰ اختیارات میں قوم کے دوسرے افراد کو بھی شریک کیا جائے۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی مُلک میں حاکم اعلیٰ قوم کے انتخابات سے مقرر ہوگا۔ اسے تمام وہ حقوق و اختیارات حاصل ہوں گے جو اس کے حکم کو کارگر بنانے کے لئے درکار

ہیں۔ البتہ نیابت یا تفویض اختیارات کے ذریعے سے وہ اپنے بعض فرائض دوسروں کے سپرد کرے گا اور انھیں وہ حقوق عطا کرے گا جس سے وہ لوگ حاکم اعلیٰ کے نائب بن کر نظم و نسق کی خدمت بخوبی انجام دے سکیں۔

نظم و نسق کے اعلیٰ حاکم کا بڑا کام یہ ہے کہ ملک کے سیاسی نظام میں توازن قائم رکھے۔ اور دیکھتا رہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اس کی مختلف قوموں کو ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے موافق رکھے اور ان کے باہمی اختلاف کی گتھیاں سلجھاتا رہے۔ قوم کے اجتماع نے اُسے وہ اختیارات تفویض کئے ہیں۔ جن کا مآخذ شریعت ہے۔ لہٰذا ملک کا اعلیٰ حاکم شریعت کے وکلا اور محافظین دونوں کے سامنے اصالتاً جواب دہ ہے۔ خواہ یہ فرائض کسی جماعت کے سپرد کئے گئے ہوں اور اسی طرح پوری قوم کا امین مسئول ہے۔ مگر اسلامی تنظیم کی طرفہ خصوصیت یہ ہے کہ اس حاکم کے نائب بھی بطور خود شریعت اور قوم کے مبعوثین کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہ طریقہ ہے جس سے اسلام کے سیاسی نظام میں حکومت عاملہ کی مجلس مبعوثین اور مجلس فقہاء کے روبرو ذمہ داری متعین ہو جاتی ہے ایسی صورت میں جبکہ حکومت عاملہ کی شکایت، پارلیمنٹ کے بجائے عام اہل ملک کو پیدا ہو یا جبکہ خود حاکم اعلیٰ نااہلی یا بدعنوانی کی بنا پر خطاوار ہو اور قوم اس کے خلاف آواز بلند کرے تو اس صورت میں بھی شریعت اسلامی قوم کی بات پر کان دھرے گی اور حاکم کے عزل کا فتویٰ دے گی۔ وہ ضابطے نہایت سادہ اور وہ ترکیب بہت ہی آسان ہے جن کے ذریعے سے اسلامی ممالک اپنے فرمانروا کو برطرف کر سکتا ہے جبکہ اس کی ناقابلیت غلط کاری۔ یا بداخلاقی اسے اس لائق نہ رکھے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں ملت اسلامی اپنے حاکم کو ایک دن میں دولت و اقبال کی بلند ترین چوٹی سے اُتار کر معمولی انسانوں کی صف میں پہنچا سکتی ہے۔

حکومت عاملہ ہر قابلیت۔ ایک حق عطا کرتی ہے اور ہر ایک حق کسی قابلیت کی دلیل ہوتا ہے۔ یہی صورتیں ہیں جن کے بہم ہو جانے سے آزادیٔ عمل پیدا ہوتی ہے۔ اگر قومی نیابت کو۔ حکومت پر نگرانی رکھنے کا حق ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ صرف قوم ہی فیصلہ کرنے

کی قابلیت رکھتی ہے کہ حکومت عاملہ کا سلوک قوم کے ساتھ اچھا ہے یا بُرا؟ اسی طرح جماعت تشریع (یا مجلس وضع قوانین) کو قانون بنانے کا حق اس بنا پر حاصل ہوا ہے کہ وہ قانون سازی کی قابلیت رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ حکومت اور نظم ونسق کے فرائض انجام دینے کے واسطے جماعت عاملہ کو بھی ایک خاص قابلیت درکار ہے اور وہ انتظامی تجربہ ہے کہ اگر حکام پہلے سے یہ تجربہ نہیں رکھتے تھے تو اب حاصل کر رہے ہیں۔ اسی سے انھیں انتظامی کاروبار کے انجام دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ پھر جس طرح حق اور قابلیت مل کر مجلس مبعوثین اور مجلس فقہا کو اپنے کام میں آزادی عطا کرتے ہیں۔ اسی طرح حق اور قابلیت سے جماعت عاملہ کو عمل کی آزادی میسّر آتی ہے اور انتظامی عمل کے میدان میں اسے کامل آزاد ہونا بھی چاہیے جس طرح پارلیمنٹ اور مجلس فقہا اپنے اپنے حلقے میں آزاد ہیں۔

حکومت عاملہ پر نگرانی رکھنے کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جماعت عاملہ کی آزادی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے جسے اپنی پسند اور ضمیر کے موافق عمل کرنا ناگزیر ہے۔ ورنہ وہ کام کیا کرے گی۔ اور جواب وہ کس بات کی ہو گی؟ پارلیمنٹ یا مجلس مبعوثین کا حق درحقیقت محض جانچنا اور تنقید کرنا ہے۔ وہ حکومت کو سمجھاتی اور جتاتی ہے۔ اس پر حکم نہیں چلاتی۔ پھر ایسے موقع پر جبکہ مبعوثین اور عمال کا باہمی اختلاف زیادہ سنگین صورت اختیار کرلے تو حاکم اعلیٰ کا کام ہے کہ وہ مداخلت کرے اور قوم کے اعتراض کے مطابق جھگڑے کا فیصلہ کرے لیکن قوم کو مطمئن کرنے کی یہ شرط بھی حکومت عاملہ کی آزادی پر کوئی قید مالایطاق عاید نہیں کرتی۔ کیونکہ جس طرح مجلس مبعوثین کا یہ فرض کہ ہمیشہ حکومت کو اس رُخ پر چلائے جس رُخ چلنے سے قوم کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں مجلس کی آزادی کے مانع نہیں ہے اسی طرح حکومت کا قوم کے حسبِ منشا کام کرنا اس آزادی کے خلاف نہیں ہے بلکہ حقیقت میں حکومت عاملہ کے قیام کی غرض ہی یہ تھی اور اگر اس حجت کو کوئی تسلیم نہ کرے تو گویا یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ جس غرض سے کوئی محکمہ بنایا گیا تھا اگر اس غرض کے مطابق اس سے کام لیا جائے تو محکمے کی آزادی میں فتور آجائے گا۔ رہے حکومت کے حقوق و لوازم تو وہ اسلامی ملک میں بھی وہی ہوں گے۔ جو ہر جگہ حکومت عاملہ کو دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ

اس کے کام بھی کم وبیش وہی ہوں گے جیسے دوسری جگہ ہوا کرتے ہیں

سیاسی فرقے ائے اور عمل کے دوسرے میدانوں کی طرح، سیاسیات کے میدان میں بھی لوگوں کے تخیلات اور مقاصد کے اختلاف سے الگ الگ گروہ ہو جاتے ہیں۔ ان اختلافات کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس ماحول میں اور جن تغیرات کی بدولت وہ ظہور میں آئے ہیں وہ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن سیاسی اختلافات ہر جگہ مختلف سیاسی فرقوں ہی کی صورت میں ظاہر ہوں تو خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ ان اختلافات کی نوعیت اور ان کی علتیں یکساں ہیں۔ چنانچہ ممالک مغرب کے سیاسی نظام میں سیاسی رقابتیں ہر جگہ آبادی کے مختلف طبقوں کی باہمی عداوت سے پیدا ہوتی ہے کہ کہیں تو ایک طبقہ اسی نظام تمدن کو اُلٹ کر اپنی حسب منشار تمدن کا نیا نقشہ جمانا چاہتا ہے۔ اور کہیں ایک فرقہ اس نظام میں اس طرح ردّوبدل کرنا چاہتا ہے کہ خود اُس کی اغراض زیادہ اچھی طرح پوری ہو سکیں اور کہیں بعض لوگ اسے جوں کا توں بحال رکھنے کے خواستگار ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے سیاسی نظام میں جو اختلافات ہوں گے وہ صرف ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع کے متعلق ہوں گے اور یہ واحد مقصد اسی نظام تمدن کو جو موجود ہے محکم اور مکمل کرنا ہوگا۔ پس مغربی نظام کے برخلاف جہاں سیاسی فرقے برابر موجودہ نظام تمدن کو بدلنے اور منسوخ کرنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ اسلامی ملک میں ان فرقوں کا کام تمدن کے انھیں آئین کو محفوظ و برقرار رکھنا ہوگا جو اسلام نے اختراع کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ مغرب میں تو سیاسی فرقوں نے ایسی تشویش انگیز وقعت حاصل کر لی ہے اور قومی ترقی پر بالکل چھائے ہوئے ہیں اور قومی سرگرمیوں کی صورت بگاڑتے رہتے ہیں کہ ملک جو کچھ کرے ان کے حسب مراد کرے مگر اسلامی ملکوں میں سیاسی فرقے اور اُن کی سرگرمیاں نسبتہً کہیں نرم اور دھیمی نظر آتی ہیں کیونکہ وہ قوم کی زندگی پر چھائے ہوئے نہیں ہوتے اور نہ کبھی ہوں گے۔ مسلمانوں کے نظام تمدن کی مغربی تمدن پر برتری کا یہ ایک اور ثبوت ہے۔

مزید برآں اگر مغربی ملکوں میں سیاسی سرگرمیوں نے ایسی غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے

تو دراصل اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے نظام تمدن کی خرابیاں دیکھتے اور ان کی درستی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

غرض واقعہ یہ ہے کہ ملت مسلمہ کی ترکیب۔ اقوام مغربی سے بہتر ہوئی ہے۔

مجلس اعیان (شعبۂ اعلیٰ) مجلس اعیان یا سینیٹ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے امراء کی جمعیت ہے جو ایک خاص طبقے اور خاص خاص افراد کے منشا اور حقوق کے تحفظ کے لئے وجود میں آئی ہے اس کا کام یہ ہے کہ قوم کی عوامیت، یا جمہوریت کے رنگ میں رنگنے سے روک تھام کرتی رہے اور افراط اور بے اعتدالی نہ ہونے دے اُس کی اصلیت یہ ہے تو ایک اسلامی ملک میں اس جماعت کی تشکیل اور قیام کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی جہاں افراد اور مختلف طبقات آبادی میں کسی قسم کی قانونی عدم مساوات کا وجود نہیں ہے اور اسی لئے یہاں وہ خطرات بھی نہیں ہیں جو مغربی تمدن کے ارتقا میں گویا تاک لگائے رہتے ہیں اسلامی ملک کو جس دانائی اور اعتدال کی اپنے ارتقا میں ضرورت پڑے گی وہ ہمیشہ اس کا واحد شعبہ مجلس جماعت فعتار کی مدد سے بخوبی بہم پہنچاتا رہے گا اور ان دونوں کی دلالت اور رہنمائی شریعت کرے گی۔

اس طرح ان محکموں کے ذریعہ سے جن کا میں نے اوپر خاکہ کھینچا۔ یعنی جماعت نگران یا مجلس مبعوثین۔ جماعت واضع قوانین اور جماعت عاملہ کے قیام سے اسلامی حکومت پوری طرح منشائے شریعت کے مطابق کام کرے گی۔ یہ جماعتیں اپنی اہلیت اور خاص خاص فرائض انجام دینے کی وجہ سے ایک دوسرے سے آزاد ہوں گی۔ اسی کے ساتھ جماعت عاملہ کو پورا اقتدار اور استعداد حاصل ہوگی اور وہ حکومت کے تمام شعبوں کو باہم اس طرح متحد رکھے گی کہ وہ شریعت حقہ کی دائمی اور کامل سیادت محفوظ رکھنے کے مقصد وحید میں سرگرم کار رہیں۔ اس طرح اسلام کی سیاسی زندگی میں بھی اسی امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا جو امن و آشتی مسلمانوں کی تمدنی زندگی میں پائی جاتی ہے اور ہم اپنے تمدنی اور سیاسی آئین میں وہ کامل ہم آہنگی پیدا کرلیں گے جس کی اقوام کو حقیقی سود و بہبود کے لئے ضرورت ہے یہ ہم آہنگی ناگزیر اور ہر آئین حکومت کا اصلی مقصود ہے اور

ہر سیاسی اصلاح کا منصوبہ یہی ہونا چاہئے کہ یہ ہم آہنگی پیدا کردے کیونکہ اس کے بغیر بہتر سے بہتر نظام تمدن بیکار اور معطل ہو جائے گا۔ بحالیکہ ناقص ترین نظام تمدن بھی اگر اپنی خوش نصیبی سے سیاسی نظام کے ہم آہنگ ہے تو ہمیشہ اس قابل ضرور ہوگا کہ ترقی کرتا رہے۔

اس مقالہ میں جیسا کہ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا، میرا مدعا صرف یہ بیان کرنا تھا کہ مسلمانوں کے نظام تمدن کے لئے جو سیاسی انتظام اور آئین حکومت سب سے موزوں اور پوری طرح مناسب حال ہے۔ اس کی نوعیت اور منشا کیا ہونا چاہئے۔ میں نے صحیح معنی میں کسی سیاسی آئین سے بحث نہیں کی۔ اس قسم کے اصولی اور اجمالی مضمون میں یہ بحث اُٹھانی بے محل ہوتی۔ قوم کا سیاسی آئین بنانا ماہرین فن کا کام ہے اور کسی خاص قوم کے واسطے آئین بناتے وقت اس کی سیاسی ضروریات کا انھیں لحاظ رکھنا ہوگا اور اس قوم کی اخلاقی اور دماغی حالت اور طبیعی خصوصیات کے مطابق اپنے آئین کو ڈھالنا پڑے گا۔ مزید برآں آئین حکومت کی ایک ہی صورت کا تمام اسلامی قوموں کے لئے موزوں ہونا قیاس میں نہیں آسکتا اگرچہ ان قوموں میں مماثلت کے بے شمار پہلو موجود ہیں۔ اسی خیال سے اگر میں نے سیاسی آئین کے متعلق قیاس آرائی کی کوشش نہیں کی تو اُمید ہے کہ ناظرین کو اس پر تعجب نہ ہوا ہوگا۔ حقیقت میں میرا مطلب تو اپنے ہموطنوں اور عام برادران اسلام کو صرف اتنا جتانا ہے کہ اگر انہوں نے مغرب کے سیاسی آئین کی نقالی اختیار کی اور اسی کے ساتھ نوع انسانی کے اسی حصہ کے تمدنی اور سیاسی اصول کے پیرو ہو گئے، تو یہ ایسی نقصان رساں غلطی ہوگی جس کی کوئی تلافی نہ ہو سکے گی۔

اگر مغربی طریقے اختیار کرنے کے حامی کسی اسلامی ملک میں یہ قابو پا جائیں کہ اپنے منشا کے موافق کام کریں، تو اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟ وہ بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ اسلام کی سب سے ممتاز خصوصیت یعنی تمدنی اتحاد اور پیوستگی کے بجائے انھوں نے اہل مغرب کے طبقوں کی باہمی نفرت اور رقابت کا بیج مسلمانوں میں بو دیا۔ انفرادی آزادی اور مساوات کو قوم میں سے مٹا دیا اور اسے طوفان بے تمیزی میں دھکا دے دیا یعنی ایسی حالت کو پہنچا دیا جس میں وہ ہمیشہ اس آزادی اور مساوات کی جستجو میں سرگرداں پھرے گی جسے خود ترک کر چکی ہے۔ اور کبھی نہ پائیگی

وہ بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ مغربی قوموں اور ان کی جماعتوں میں جو باہمی نفرت پائی جاتی ہے ۔ وہ نفرت جس میں رحم و آشتی کی گنجائش نہیں ہے اسلام کی عزیز و جمیل اُخوت کی جگہ مسلمانوں پر مسلط ہے اور وہ مشترک مقصد جس نے آج ان سب کو ایک رشتے میں متحد کر رکھا ہے غائب ہوگیا: طرح طرح کے جھوٹے عارضی اور فرضی مقاصد کی گنجائش نکل آئے گی جو دراصل نفس پرستی، قصور طبائع اور لوگوں کی ہنگامی ضروریات کی پیداوار ہوں گے جن سے افراد اور جماعتوں میں پھوٹ پڑجائیگی اور دائمی رقابت اور مخاصمت کی بلا میں گرفتار ہوجائیں گے۔ اس وقت جاکر بے شبہ تقلید یورپ کے حامیوں کو معلوم ہوگا۔ اگرچہ بعد از وقت معلوم ہوگا کہ کسی قوم کی اقتصادی آسودگی اور سیاسی اقتدار کے احیار یا اسے غیروں کے تسلط محفوظ رکھنے کی یہ سبیل نہیں ہے کہ اس قوم کی اخلاقی اور تمدنی تنظیم درہم برہم کردی جائے اور اسے لانظمی کے تلاطم میں ڈال دیا جائے۔

تفرنج یا تقلید مغرب کے اثرات کی نسبت جو خطرناک مغالطے پیدا ہوتے ہیں ان کی علت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ حامیان مغرب کا تخیل ناقص اور ان مسائل سے جو اسلامی دنیا کے واسطے حد درجہ اہم ہیں۔ ان کی واقفیت بالکل ادھوری ہے اور بایں ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ ان مسائل سے ایسی نادانی کے ساتھ گویا کھیلتے ہیں جو ان کی نادانی کی تحریک تک کے لائق نہیں ہے۔ یہ قابلِ افسوس مغالطے ان لوگوں کو وہ نقصان دیکھنے نہیں دیتے جو تقلید مغرب احلامی دنیا کو لامحالہ پہنچائے گی۔ اور یہ نقصان ہمیشہ اسی تناسب سے پہنچے گا جس مقدار میں ہم مغرب کی تقلید کریں گے۔ گویا جس قدر زیادہ تغیر ہوگا اسی قدر زیادہ اسلامی دنیا کو نقصان پہنچے گا جو آخر میں اسے بالکل برباد کرڈالیگا۔ یہ افسوسناک مغالطے اپنے نادان مبتلا کو یہ حقیقت دیکھنے نہیں دیتے کہ ملت اسلامی کی بقا صرف اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی تمدنی، سیاسی اور اقتصادی زندگی اسلامی حقائق کی ناقابل تغیر ابدی بنیادوں پر تعمیر کی جائے۔

آخر میں مجھے اتنا اور بڑھا دینا چاہئے کہ تعلیم یافتہ مسلمان جب یہ سوچتے ہیں کہ ہم مغرب کی نقل اُتارنے اور اس کے اصول سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں تو وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ کم سے کم ان میں سے

اکثر صاحبوں نے ایک غلط منوبہ قائم کر لیا ہے۔ جو ان کے پیش نظر کام کے صریحاً نامناسب ہے۔ وہ یہ سمجھنے ہی میں قصور کر رہے ہیں۔ کہ ان کا واحد مقصد، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ خود ان کے وجود کا واحد جواز ہی یہ ہے کہ اسلامی اصول کے تمام حقائق کی ترجمانی کریں اور بتائیں کہ عمل میں ان کی کامل صورت کیا ہوگی؟ اور جہاں تک ان کی طاقت میں ہے انہی اسلامی اصول کی حمایت اور خدمت گزاری کرتے رہیں۔ نظر بہ آں وجوہ گو وہ خود اس بات کے سمجھنے میں کوتاہی کر رہے ہیں لیکن فی الواقع ان کے سارے ولولوں کا سرچشمہ تو اسلام کی بہترین روایات اور اعلیٰ ترین تعلیم ہونی چاہیئے تاکہ وہ دنیا کی رہنمائی کر سکیں نہ یہ کہ خود دوسروں کے مقلد بنجائیں انھیں تو اپنا اُسوۂ حسنہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیئے نہ یہ کہ دوسروں کے نمونے کی پیروی کرنے لگیں۔ صرف اسی صورت میں تعلیم یافتہ مسلمان اس قابل ہوں گے کہ انسانی ترقی کی مشترکہ کوشش میں حصہ لیں اور دنیا کی وہ قابلِ قدر خدمت انجام دیں جو اسلام کا جائز حق ہے۔ اس کے سوا وہ اگر کسی دوسری ڈگر پر چلے تو پھر اغیار کا اسلامی دنیا پر قبضہ غیر معین مدت تک قائم رہے گا اور نہ معلوم کب تک مسلمان اجانب کی غلامی کی لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ انھیں کبھی اپنے غیر قوم کے حکمرانوں کی برابری نصیب نہ ہو سکے گی اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ ذلیل و خوار ہو کر وہ دائماً اقوام مغربی کے محکوم رہیں گے۔

اس میں کلام نہیں ہے کہ دور جدید کے مسلم ارباب فکر کے لئے اصلاح اُمت کا یہ کام انجام دینا کچھ سہل نہیں ہے۔ لیکن وہ جس قدر دشوار ہے اُسی قدر شاندار بھی ہے۔ بے شبہ اس میں بڑے استقلال، ایثار، بے نفسی۔ ہمت و حوصلہ مندی اور سب سے بڑھ کر اسلام کی حقانیت اور فتح پر کامل ایمان رکھنے کی ضرورت ہے ایسا ایمان جس میں کبھی لغزش نہ ہو اور جو خلوص و جوش سے مملو ہو کہ ہمارے تعلیمیافتوں کو قوت دے کر سُورما بنا دے اور انھیں اپنے زور بازو پر وہ اعتماد عطا کرے۔ جو اس دشوار مہم کو سر کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس اہلیت کے واسطے اعلیٰ درجے کے اخلاقی اوصاف درکار ہیں اور اگر یہ اہلیت نہیں تو مسلمان اربابِ فکر کا یہ دعوے بھی باطل ہوگا کہ انھیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

تنقید و تبصرہ

۱۔ **اسلامی تعلیم** :۔ مؤلفہ جناب ظہیر احمد صاحب عثمانی۔ ماہر تبلیغ — شائع کردہ کتاب خانہ "سعادت" سرکلر روڈ۔ موچی دروازہ لاہور

۳۲ صفحات۔ قیمت فی جلد ۲ر

۲۔ **ہمارے بزرگ** (حصہ اول) مؤلفہ جناب رشید اختر صاحب ندوی

۱۱۲ صفحات۔ قیمت ۸ر فی جلد

یہ دونوں کتابیں مسلمان بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہندوستان (بالخصوص مسلمانوں) میں ایسے مصنفین کی بہت کمی ہے جو بچوں کے لئے مفید چیزیں لکھ سکیں۔ یہ موضوع جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے، اسلامی تعلیم میں دوزخ کے سانپ بچھوؤں سے ڈرایا گیا ہے۔ میکائیل کے ذمہ "لوگوں کو روزی پہنچانے اور پانی برسانے کا کام" بتایا گیا ہے۔ "ہمارے بزرگ" میں **معراج** کو "آسمان پر اڑنا" (ص۱۸) لکھا ہے۔ ایک صحابیؓ کا ایک نبیؐ سے "ایمان کی بازی لگاکر برابر رہنے" کا تذکرہ ہے (ص۲۷)۔ حضرت عمرؓ کا دریائے نیل کے نام خط لکھنے کا واقعہ درج ہے لکھا ہے کہ وہ خط سطح نیل پر رکھدیا گیا تھا اور اس کے بعد نیل نے کبھی لوگوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ (ص۶۳) اندازِ بیان میں بھی ایسی چیزیں ہمیں کھٹکتی ہیں کہ "صدیقؓ کے پاس جتنی دولت تھی اسے اُنھوں نے محمدؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔" (ص۱۹) حضورؐ کا اسم گرامی تعظیمی الفاظ کے بغیر۔ کم از کم ہم تو اسے روا نہیں رکھ سکتے اور پھر بچوں کے لئے؟

۳۔ **تحریک پاکستان** :۔ از سید انیس الدین احمد رضوی۔ شائع کردہ۔ دارالاشاعت ستارہ ہند بریلی ضخامت ۱۵۲ قیمت ۸ر اس مختصر سی کتاب میں تحریک پاکستان کے پس منظر اور اس کی تدریجی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدائی

معلومات کے لئے کتاب مفید ہے۔ مخالفین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر اس تحریک کے عملی پہلو پر بھی کچھ لکھدیا جاتا تو اس کی افادیت بڑھ جاتی۔

۴۔ یادِ اقبال ۔ حصہ اول۔ مرتبہ جناب غلام سردار صاحب نگار ایڈیٹر پیغام حق۔ شائع کردہ۔ اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاجپورہ۔ لاہور، کتابت، طباعت، کاغذ، ٹائٹل نہایت عمدہ صفحات ۱۲۰ قیمت غیر مجلد عہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی وفات پر جو نظمیں شائع ہوئی تھیں انھیں یکجا کیا گیا ہے۔ کوشش اچھی ہے، بکھرے ہوئے مضامین یا نظموں کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا پڑھنے والے کے لئے سہولت بہم پہنچاتا ہے، لیکن حیرت ہے کہ اس مجموعہ میں جناب آسی ملتانی کا مرثیہ کہیں نظر نہیں پڑا جو طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ اسکی اہمیت اس لئے نہیں کہ وہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا بلکہ اس لئے کہ حضرت علامہ رح کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا۔ ہمارے نزدیک وہ ان سب میں بہتر تھا۔

۵۔ تفسیر سورۂ عبس :۔ تالیف مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ۔ ترجمہ جناب امین احسن صاحب اصلاحی۔ سرائے میر اعظم گڑھ، حضرت علامہ فراہی رح کی ذات گرامی قارئین طلوع اسلام کیلئے محتاج تعارف نہیں۔ قرآن کریم کے متعلق آپ کی خدمات کا تذکرہ ان صفحات میں کئی بار آ چکا ہے۔ زیر نظر تفسیر انہی کے فہم قرآن کا نتیجہ ہے اور ان تمام خوبیوں کی حامل جو ان کی تفسیر میں ہوا کرتی ہیں، یہ نایاب چیزیں مغتنمات میں سے ہیں۔ ۶ر اس کی قیمت رکھی گئی ہے۔

۶۔ قانون مرکزیت :۔ (یعنی قیام صلوٰۃ اور اجتماعی زندگی) شائع کردہ ادارۂ اصلاح وتبلیغ۔ جامع آسٹریلین لاہور، ادارۂ اصلاح و تبلیغ نے اسلامی محکمات کے مختلف شعبوں کے متعلق مختصر پمفلٹ شائع کرنیکا سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر پمفلٹ میں نماز با جماعت اور خطبات جمعہ کی اہمیت پر سلیس اور واضح انداز میں لکھا گیا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ جامع آسٹریلین میں شام کی نماز کے بعد ان امور کے متعلق عملی تعلیم بھی دی جایا کریگی۔ یہ سلسلہ مفید ہے اور اس کے لئے اس ادارہ کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ یہ ٹریکٹ بغرض اشاعت ... دیا جا رہا ہے۔

۷۔ جذبات توحید :۔ مؤلفہ جناب مولوی مشتاق احمد صاحب فاضل دیوبند۔ گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ ضلع مظفر گڑھ، کتابیں تو بہت سی دیکھنے میں آتی ہیں لیکن ان میں کام کی چیز کبھی کبھی نظر سے گزرتی ہے، مولوی مشتاق احمد صاحب یوں تو پرانی طرز کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن اللہ تعالےٰ نے انھیں توفیق عطا فرمائی کہ وہ عجمی تصورات کو الگ کر کے قرآن کریم کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے اپنے فہم قرآن کے نتائج کو اس

پہلی تصنیف میں قلمبند فرمایا ہے اور جو مشرکانہ رسوم وعقاید بالعموم مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں۔ قرآن کریم کی روشنی میں ان کی تردید کی ہے۔ اگرچہ بعض بعض مقامات پر ہنوز پچھلے خیالات مؤلف کے دامنگیر ہیں۔ لیکن بہ ہیئت مجموعی کتاب بڑی مفید ہے۔ کے مسلمان نوجوانوں کی ایک جماعت نے بغرض تبلیغ اسے شائع کیا ہے اور صرف ۸ر میں (غالباً مؤلف سے) مل سکتی ہے۔ یہ صرف لاگت کا صرفہ ہے۔

۸- ہمارا پنج سالہ پروگرام - کسی قوم میں مفید اور صحیح خطوط پر متشکل لٹریچر کا شائع ہونا۔ اس قوم کی خوش بختی کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں ذہنی تربیت لٹریچر ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ مسلمانانِ ہند جہاں اور میدانوں میں زندہ اقوام سے پیچھے ہیں۔ اس شعبہ میں بھی اُن کی تہی مائگی محتاج تشریح نہیں۔ حالانکہ یہ وہ قوم تھی جس نے ساری دنیا کو بتایا تھا کہ لٹریچر کسے کہتے ہیں۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ۔ دہلی ایک عرصہ سے کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام کر رہا ہے۔ اب اُنھوں نے اپنا پنج سالہ پروگرام شائع کیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ آئندہ پانچ سالوں میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ارباب نظر اس شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس پروگرام کو دیکھیں اور اپنے مشوروں سے مکتبہ سے تعاون کریں۔ ہمیں تو ایک ہی جنون ہے اور ہم جو کچھ کہیں گے اسی کے ماتحت کہیں گے۔ یعنی یہ کہ مسلمان جس شعبۂ زندگی میں بھی کام کرے۔ اس کے سامنے کامیابی کا معیار صرف یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ اس لئے ہم مکتبہ جامعہ ملیہ کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ غیروں کی کتابیں شائع کریں یا اپنوں کی۔ نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ ؎

تراجم شائع کیجئے تو جہاں جہاں ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

کسی کے خیالات۔ اسلامی تعلیم کے خلاف جاتے ہوں تو اس کی تردید کیجئے۔ دوسروں کی کتابیں شائع کیجئے تو بھی ہر اختلافی مقام پر ضمنی نوٹ دیجئے۔ خود جو کچھ لکھوائیے۔ اسی نظام کے ماتحت لکھوائیے کہ پڑھنے والے کا ہر قدم "جانب کعبہ" اُٹھے۔ انشاءاللہ مسلمانوں کی تائید اور اللہ کی نصرت آپ کے شامل حال ہوگی۔

پروگرام کا نسخہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے بلاقیمت مل سکے گا۔

سلیم کے نام.....پانچواں خط

سلیم! دیکھا نا۔ چار دن گاؤں میں رہے اور انسانیت کی ہڈیوں کے اندر چھپی ہوئی چوٹیں کس طرح ابھر کر تمہاری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ میں نہ کہتا تھا کہ اس شہری چمک دمک کی نظر فریب چار دیواری کو چھوڑ کر گاؤں میں جاؤ اور زندگی کو سکرات موت کی ہچکیاں لیتے ہوئے دیکھو۔ جاؤ اور وہاں انسان نہیں بلکہ انسانوں کی لاشوں کو چلتے پھرتے دیکھو۔ دیکھو اور پھر اپنے دل سے پوچھو کہ قوم کی صحیح حالت کا مقیاس (METRE) شہروں میں ہے یا شہروں سے دور ویرانوں میں کہ جنھیں شہر والے دیہات کہتے ہیں تمہاری شہری زندگی کا شفق آگیں تمدن تو رخسارِ قوم پر مصنوعی غازہ ہے جس کی سرخی صرف نگاہوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔ چہرے کا اصلی خون اور خون کی صحیح رنگت دیہات کے اندر ہے۔ غازے سے چہرے کی زردی چھپائی جا سکتی ہے۔ سرخی میں تبدیل نہیں لیجا سکتی۔ شہری زندگی کی اصلاح اور وہاں کے باشندوں کی بہبود و فلاح گلگونے اور غازے کی فراہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہاں کی مرفہ الحالی اور فارغ البالی پر قوم کی عام حالت کو محمول کر لینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی اجتماعِ عید کے گلستانی منظر کو مسلمانوں کی بہارِ زندگی کا آئینہ دار قرار دیدے۔ ان شہروں میں بسنے والوں کو کیا علم کہ ان کی قوم کے اسّی نوّے فیصدی افراد پر کیا گذر رہی ہے جو دیہات کے زندہ قبرستانوں میں زندگی کے مقررہ سانس گن رہے ہیں۔ وہ شہری جو شام کی ہوا خوری کی غرض سے پانچ سات روپیہ کا پٹرول پھونک ڈالیں انہیں کیا معلوم کہ اس بھک سے اڑ جانے والے پٹرول کی قیمت میں کتنی قیمتی جانیں بھوک کی موت سے بچائی جا سکتی ہیں۔ وہ شہری جو ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ فی کس عصرانہ (EVENING TEA) پر صرف کر ڈالیں انہیں کیا خبر کہ اس ایک چائے کے صرفہ میں ایک کنبہ مہینہ بھر تک روٹی کھا سکتا ہے۔ وہ شہری جن کی کوٹھیوں میں پاؤں کے نیچے روندے جانے کے لئے پانچ پانچ ہزار روپئے

سے قالین نہ بچھے ہوں وہ کیا جانیں کہ ایک قالین کے بدلے پورے کا پورا گاؤں ہلاکت کے خونی پنجہ سے بچایا جاسکتا ہے سلیم ! یہ شہری کیا جانیں کہ زندگی کس بھاؤ بکتی ہے اور خدا کی مخلوق پر کیا گذر رہی ہے

جو نہیں آشنا مصیبت کا — درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا — جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رو دیا

وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے !
اُسے معلوم کیا خدا کیا ہے ؟

سلیم اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ افلاس اور بھوک کی شدت نے غریب و نادار کاشتکار کا کیا حال کر رکھا ہے ۔ وہ سال بھر تک مصیبتیں اٹھاتا اور شقتیں جھیلتا ہے ۔ مئی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اپنے سر پر لیتا ہے دسمبر اور جنوری کی کپکپاتی سردیوں کو گاڑھے کے ایک کرتے میں برداشت کرتا ہے ۔ اور سال بھر کی محنت و مشقت کے بعد جب دیکھتا ہے کہ پیدا وار مہاجن لے گیا ۔ اور رہا سہا اثاثہ مالیہ کی وصولی میں نمبردار نے قرق کرا لیا ۔ تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اسے کوئی بات نہیں سوجھتی ۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بالآخر ہو کیا رہا ہے ! میں نے ایک مرتبہ **جیونو** (کھوکر) کے آمد و خرچ کا سرسری حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس غریب کو ایک آنہ روزکی بھی یافت نہیں ۔ حالانکہ وہ خود اس کے دونوں بیٹے اور بیوی سارا گھر کا گھر سال بھر تک یوں رات دن ایک کر دیتے ہیں جیسے کوئی کولھو میں جُتا رہا ہو تمہیں معلوم ہے کہ علی بخش (چوہان) کا بیٹا ابھی ابھی قید کاٹ کر آیا ہے ۔ بڑا نیک لڑکا تھا ۔ میں نے پوچھا کہ **قادرے** تم کسی بری صحبت میں بیٹھ گئے کہ آخر کال کوٹھڑی تک جانے کی نوبت آگئی ۔ سنو سلیم ! اس نے کیا جواب دیا ۔ کہنے لگا بابوجی ! چار برس متواتر ہو گئے ۔ دن رات ڈھور ڈنگر کی طرح کام کیا لیکن قسم لے لو جو پیٹ بھر کر روٹی ملی ہو ۔ زمین لالہ کے پاس چلی گئی ۔ گھاس کھود کر بھی دیکھ لیا ۔ لیکن لوگوں کے پاس اپنے کھانے کو کچھ نہیں مال مویشی کو چارہ خرید کر کون ڈالتا ہے ۔ بالآخر تنگ آگیا تو سوجھی کہ جیل خانے چلے چلو ۔ کام اس سے زیادہ کیا لیں گے جواب کرتا ہوں ۔ اور روٹی کی ذمہ داری ان کے سر ہوگی ۔ سلیم ! میں نے سنا اور

آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا کہ یا اللہ! تیری یہ وسیع و عریض زمین تیرے بندوں پر اب اس درجہ تنگ ہو چکی ہے کہ لوگ روٹی کی خاطر جیل جانے پر مجبور ہو رہے ہیں کہو سلیم! تمہارے ان بڑے بڑے طرہ باز شہریوں کے تصور میں بھی یہ منظر آسکتے ہیں! "ہمدردیٔ نوعِ انسانی"۔ "مساوات"۔ "آزادی" "کسانوں کی بہبود" "مزدوروں کی خدمت"، نرم نرم الفاظ کی خوشنما ترکیبیں ہیں جو شہر کے بلند ایوانوں میں ڈھلتی اور رفیع المنزلت پلیٹ فارموں سے فضا میں نشر کیجاتی ہیں۔ وہ الفاظ جو معانی سے اسی طرح معرا ہوتے ہیں جس طرح ان شہریوں کے کمروں میں کاغذ کے پھول اور کپڑے کی بیلیں حسنِ نکہت و شبابِ لطافت سے عاری۔ سوچو سلیم! کہ جس قوم نے اپنی ریڑھ کی ہڈی کو یوں کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ رکھا ہو کہ اسے گھن کھاتا ہے تو کھا جائے اس قوم کی زندگی کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔

مائی **برکت بی بی** کی موت کی خبر سے افسوس ضرور ہوا لیکن (خدا مجھے معاف کرے) اچھا ہی ہوا۔ بچاری زمین و آسمان کی آفات سے محفوظ ہو گئی۔ ضعیفی۔ بیماری۔ بھوک۔ اور ان سب پر اس کا جنون غریب کیا ایک مصیبت میں تھوڑی گرفتار تھی؟ برکت بی بی اس دنیا میں نہ رہی لیکن اس کی داستانِ الم انگیز کلنک کے ٹیکے کی شکل میں تمہاری قوم کے ماتھے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہ گئی۔ تم نے اس بچاری کی مصیبت کی کہانی تو سنی۔ لیکن کچھ غلط اور کچھ نامکمل۔ تمہیں وہاں سناتا بھی کون۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں سے لے دیکے چوہدری **جھنڈو خاں** باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ مقلد غیر مقلد کے جھگڑے میں اس کے سر پر جو چوٹیں آئیں۔ اس سے اس کا حافظہ بہت بے ربط ہو گیا ہے۔ اس جھگڑے میں وہ غریب یونہی پٹ گیا اس کی جانے بلا کہ بڑے پیر جی کی گیارہویں کیوں دیتے ہیں۔ ایک رسم تھی جو گھر میں چلی آتی تھی۔ وہ بھی اس کا پابند تھا لیکن وہابی اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ آرام سے سمجھاتے بجھاتے تو ممکن تھا بات اس کی سمجھ میں آجاتی۔ لیکن اس سے جہاد کا ثواب کیسے ملتا؟ پیٹ ڈالا بچارے کو۔ اور لطف یہ کہ گاؤں میں گگے پیر (سانپوں کے دیوتا) کی کڑائی اب تک چڑھتی ہے۔ اسے کوئی نہیں روکتا وہابیوں کی ابتداء اور انتہا بھی اپنے اندر عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں رکھتی ہے۔ جڑ دیکھو تو شہداء کے مقدس خون سے نم یافتہ اور شاخیں دیکھو تو آمین بالجہر و خفی کے مباحث کی **اکاس** بیل سے جکڑی ہوئیں۔

وہ ابتداء کے لئے تھا یہ انتہا کے لئے۔

ہاں۔ **برکت بی بی** مرحومہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ آؤ تمہیں میں بتاؤں کہ وہ کون تھی اور اس کی بپتا کی داستان کیا تھی۔ جھنڈو خاں ہی کے الفاظ میں سنو جو اس نے ایک عرصہ ہوا مجھ سے کہے تھے۔ اس نے حقہ کا کش لگایا اور کہا۔

"گاؤں میں ایک غریب زمیندار تھا۔ کریم بخش نام۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق لڑکے کی شادی پر برادری کو کھانا کھلایا۔ شام کے وقت جب لوگ چوپال میں بیٹھے تھے، چوہدری فتح خاں بولا" ہوں! بیاہ رچانے بیٹھا ہے، اس سے اچھا تو ہم نے بڑھیا کا چالیسواں کر دیا تھا" میراثی نے حقہ پیش کرتے ہوئے جھک کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کہا" غریب نواز! سرکار کی کیا بات ہے؟" چوہدری فتح خاں نے یہ بات آج کوئی نئی نہیں کہی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو، کسی کا شگن ہو، کسی کا لگن ہو وہ ہمیشہ کچھ ایسی ہی بات کہتا۔ اور ایک فتح خاں پر ہی کیا موقوف، گاؤں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ چوہدری فتح خاں کا بیٹا جوان ہوا، شادی کے دن قریب آ گئے۔ ایک شام چوہدرانی نے کہا کہ یوں تو گھر میں سب کچھ تیار ہے۔ لیکن بالائی خرچ کے لئے روپیہ کافی نہیں اگر کسی بات میں کسر رہ گئی تو برادری میں ناک کٹ جائیگی چوہدری فتح خاں صبح سویرے سیدھا شہر کی طرف گیا اور لالہ بنواری داس کی دوکان پر پہنچا وہ منڈی کا آڑھتیہ اور گاؤں کا مہاجن تھا۔ چوہدری اس سے پہلے کبھی اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا اور لالہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔ گاؤں کی تمام باتیں ہر روز لالہ کے کان تک پہنچ جاتیں۔ چوہدری کو آتے دیکھکر بہت خوش ہوا۔ دوکان سے اٹھا، پرنام کیا، چارپائی بچھوائی، حقہ بھر دیا، شربت پلایا، کچالو کی چاٹ منگائی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا، چوہدری کچھ اداس سے معلوم ہوتے ہو۔ کیا بات ہے چوہدری نے کہا "نہیں کچھ نہیں" لالہ نے کہا "پھر بھی؟" چوہدری بولا "تمہیں معلوم ہے کہ لال خاں کی شادی ہے کچھ روپیہ چاہیئے" لالہ نے ہنس کر کہا "بھولے بادشاہ! یہ بھی بھلا کوئی فکر کی بات ہے، چھورا ہمارا، یہ دوکان تمہاری، پرمیشور کا دیا بہت کچھ ہے جتنا جی چاہے لیجاؤ۔ تم نے کون سا روز روز بیاہ کرنا ہے" چوہدری فتح خاں نے پانچسو روپیہ لالہ سے لیا۔ لالہ نے بہی میں کچھ لکھا اور اس پر چوہدری نے انگوٹھا لگا دیا۔ لال خاں کی

شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ بارات کے ساتھ ایک چھوڑ دو۔ دو طائفے، آکھی جان جگراؤں والی، اَتو ڈومنی، رحیم آباد کے بھانڈ، رام نگر کے آتش باز، انگریزی بینڈ باجہ، کہتے ہیں کہ پچاس روپے کے ٹکے تو بہو کی ڈولی پر سے نچھاور کر دیئے، چوہدری فتح خاں دل میں خوش تھا کہ کسی کے طعن و تشنیع سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن برادری کی زبان کون پکڑے۔ انہوں نے پھر بھی بلبیوں باتوں میں کیڑے ڈال دئیے۔ لیکن شادی کا چرچا دور دور تک ہو گیا۔

"فصل نہایت عمدہ تھی۔ گیہوں، چنا، جو، سرسوں سب بور رکھے تھے۔ کسان کے لئے کچی فصل کی ایک ایک بال جان سے عزیز ہوتی لیکن لالہ جی کا منیم ہر تیسرے دن آجاتا کہ لالہ جی نے چارہ منگایا ہے چارو ناچار ہری فصل کاٹ کر دینی پڑتی۔ چوہدری فتح خاں کے بیل تو کُٹی پر گذر کرتے اور لالہ بنواری داس کا ٹٹو گیہوں کی دودھیا بالیں کھاتا۔ فصل پک کر تیار ہوئی۔ کھلیانوں میں غلہ جمع ہوا تو لالہ جی کا منیم آگیا، غلہ اٹھوایا اور چوہدری کو ساتھ لیکر منڈی تک پہنچ گیا۔ لالہ نے چارپائی بچھوائی، حقہ منگایا، چوہدری کو لال خاں کے بیاہ کی باتوں میں لگائے رکھا۔ ادھر غلہ تلتا رہا۔ خود ہی تولا خود ہی حساب لگایا۔ چوہدری کی جانے بلا کہ کیا وزن ہوا؟ نرخ کیا ہے؟ حساب کس طرح کیا گیا؟ لیکن لالہ نے خود ہی کہا کہ "نہ مہاراج بخشش لاکھ ٹکے کی، حساب پائی پائی کا۔ سن لو کر چار اڑھیا ساڑھے سینتیس، اٹھنی اوپر کی چھوڑی۔ لگا چوہدری اڑتیس پر انگوٹھا" چوہدری نے بھی پر انگوٹھا لگا دیا۔ لالہ نے "اٹھنی" کے بتاشے منگائے اور کہا کہ ہماری طرف سے لال خاں کی بہو کو دیدینا چوہدری فتح خاں خوش ہوا کہ لالہ تو دوست بن گیا۔ حساب میں سے بھی "اٹھنی" چھوڑ دی۔ اور خاطر تواضع الگ رہی۔ گھر میں پیسہ نہ تھا، کپڑے کی ضرورت ہوئی تو لالہ کی دوکان سے، نقد کچھ چاہیئے تو لالہ کے ہاں سے جو لالہ جی کے جی میں آتا، چوہدری کو بھجوا دیتا اور جو جی میں آتا بہی میں درج کرتا۔ جب بھائی چارہ ہو گیا تو پھر وشواس کا ہے کا؟

"چوہدری نے جو گیہوں گھر میں کھانے کے لئے رکھا تھا۔ اس میں سے کچھ نمک، مرچ، مصالحہ کے لئے گاؤں کے بنیئے کی دوکان پر پہنچ گیا۔ کچھ دھوبی، سقہ، نائی، کمہار، شاہ جی لے گئے۔ دوسرے ہی مہینے یہ حالت ہو گئی کہ لالہ جی کے نوکر تو چوہدری فتح خاں کا موتیوں جیسا گیہوں کھاتے اور چوہدری کے ہاں

مکّی اور باجرہ پکتا تھا۔ بوائی کا موسم آیا، چوہدری نے بڑی محنت سے زمین تیار کی۔ لیکن بیج کے لئے غلّہ نہ تھا لالہ کے ہاں پہنچا۔ لالہ نے کہا" غلہ کی کیا پرواہ۔ منوں لیجاؤ۔ لیکن پرسوں مل سکیگا، چابی بہو کے پاس ہے اور بہو ایک شادی پر گئی ہے" پرسوں آیا تو لالہ موجود نہ تھے۔ غرضیکہ لالہ ملا تو بہو نہ تھی اور بہو ملی تو لالہ نہ تھا۔ بوائی کے دن گنے چنے ہوتے ہیں۔ وقت پر بیج نہ ڈالا جائے تو فصل کیا ہو۔ بیج بے وقت ملا اور ملا بھی ناقص۔ مجبوراً وہی ڈالنا پڑا۔ ایک بیج ناقص، پھر بدقسمتی کہ بارش وقت پر نہ ہوئی، بازار میں نرخ گر گئے جو گیہوں چار پانچ روپے من بکا کرتا تھا۔ اب ڈیڑھ دو روپے سے آگے نہ بڑھتا۔ سال بھر جو کچھ لالہ کی دکان سے آتا۔ وہی اتنا ہو جاتا کہ اس غلّہ کی قیمت سے ادا نہ ہو سکتا تھا۔ پہلے تو بہو کا زیور بکا۔ پھر ایک کھیت رہن رکھا گیا۔ ایک بیچا دوسرا بیچا۔ تیسرا رہن ہوا۔ یہ گیا وہ گیا۔ اوپر تلے فصلیں خراب ہوئیں، نرخ گر گئے چوہدری فتح خاں ہزار ترکیبیں نکالتا، بڑی محنت کرتا اپنے گذارے کے لئے سب کچھ پیدا کر لیتا لیکن لالہ جی کچھ ایسا چکی کا پاٹ ہو کر گلے پڑے تھے کہ اٹھائے نہ اٹھے اور چھڑائے نہ بنے۔ پانچ ہی سال میں یہ حالت ہو گئی کہ ایک چپہ بھر زمین پاس نہ رہی۔ زمین کی قیمت گر گئی۔ جو کھیت پانچویں رہن رکھا تھا، اس کی قیمت اب چار سو رہ گئی تھی۔ بیل بک گئے، بھینسیں مر گئیں، نہ کھانے کو اناج نہ جوتنے کو زمین، عمر بھر کاشتکاری کے سوا اور کچھ نہ کیا تھا۔ روٹیوں سے محتاج ہو گیا۔ غریبی میں گھر میں اتفاق بھی نہیں رہتا۔ ساس ہمیشہ بہو کو طعنے دیا کرتی کہ جب سے یہ سبز قدم آئی ہے، ابا گھر اجڑنا شروع ہو گیا۔ لے دے کے ایک مکان رہ گیا تھا۔ لالہ بنواری داس کی اس پر بھی نظر تھی وہ اسے نیلام نہیں کرانا چاہتا تھا بلکہ خود لینا چاہتا تھا چوہدری فتح خاں مکان دینے پر کس طرح رضامند ہو جاتا؟ بزرگوں کی نشانی سر چھپانے کا ایک ہی آسرا چڑیا اپنے گھونسلے کو ویران ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ لالہ کی بہت منتیں کیں۔ گاؤں والوں نے بھی کہا لیکن لالہ کہتا" میں نے ایک سادھو مہاتما کو بچن دے رکھا ہے، یہاں اس کے لئے سمادھی بنواؤں گا۔ یہ تو دھرم ارتھ کا کام ہے، ورنہ مجھے اس مکان کو لیکر کیا کرنا ہے"

یہاں پہنچکر جھنڈو خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ دیر رکا۔ حقہ کا ایک لمبا سا کش لگایا۔ اور پھر کہانی شروع کر دی۔ کہا:۔

"حبب لالہ نے دیکھا کہ فتح خاں کسی طرح مکان دینے کے لئے تیار نہیں، تو اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور خرچہ رکھوا کر چوہدری کو جیل خانے بھجوانے کا حکم لے لیا۔ لال خاں کو کاتک میں جاڑے کا بخار آیا تھا۔ ایک دو دن گاؤں کے سیانے نے کچھ دوا دارو کر دیا لیکن پیسہ پاس نہ تھا، علاج کس طرح ہوتا۔ بخار بگڑ کر پرانا ہو گیا جس دن چوہدری فتح خاں کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں، لڑکے کی حالت نازک تھی۔ چوہدری نے ایک مہینہ جیل میں کاٹا۔ بالآخر مجبور ہو کر مکان لالہ کو لکھ دیا۔ عمر بھر عزّت کی زندگی بسر کی تھی۔ دن کی روشنی میں گاؤں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ رات کے اندھیرے میں مکان پر پہنچا۔"

اب جھنڈو خاں کی آواز رک سی گئی۔ معلوم ہوتا تھا گھگھی بندھ رہی ہے۔ اس نے ایک کش اور لگایا، پھر ہمت کر کے بولا۔

"چوہدرانی نے آہٹ پا کر کہا" کون ہے بیٹا لالو! آؤ بیٹا تم کہاں گئے تھے میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں، روٹی لے کر بیٹھی ہوں، بندو تمہیں یاد کرتے کرتے سو گیا" فتح خاں نے کہا" لالو کہاں ہے؟ بڑھیا بولی۔ "گاؤں کے لوگ اسے باہر لے گئے تھے، اب تک واپس نہیں آیا چوہدری فتح خاں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب سمجھا کہ بیٹا بھی چل بسا اور بیوی نہ صرف آنکھیں ہی کھو بیٹھی بلکہ پاگل بھی ہو گئی۔ بہو گاؤں میں کسی کے ہاں مزدوری کرنے گئی تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے، جاڑے کے دن، باہر بالکل اندھیرا تھا۔ پتہ نہیں فتح خاں کے جی میں کیا آئی کہ باہر نکل گیا۔ اور پھر نہ پلٹا۔ کھیتوں کے رکھوالے لڑکوں نے بیان کیا کہ بجلی کی چمک میں کوئی شخص اس رات شہر کی طرف جاتا دکھائی دیا تھا مچھیروں نے بھی ذکر کیا کہ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص **لالو اور بنواری** کو پکار رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی آواز ندی کے شور میں گم ہو گئی"۔

یہاں پہنچ کر جھنڈو خاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ گلا بالکل بیٹھ گیا۔ حقہ الگ کر کے رکھ دیا۔ ایک سرد آہ کھینچی اور کہا بیٹا! یہ ہے اندھی، پگلی برکت بی بی۔ چوہدری فتح خاں کی بیوی۔ لال دین کی ماں۔ گاؤں کے عزت دار گھرانے کی بیٹی اور عزّت دار گھرانے کی بہو۔ آج دنیا میں اس کا کوئی نہیں!

اتنا کہا اور جھنڈو خاں دیوار کے ساتھ لگ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

سلیم! یہ تھی مائی **برکت** کی داستان!! میں سمجھتا ہوں کہ تم کہہ دوگے کہ فتح خاں کو کس نے کہا تھا کہ چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلائے۔ کیوں اتنا خرچ کیا جو بعد میں یوں مصیبت بھگتنی پڑی۔ تمہارا کہنا درست ہے! لیکن بھائی وعظ کہدینا آسان ہے ذرا سوچو تو سہی۔ تمہارے شہروں میں آئے دن ہسپتال کھلتے ہیں۔ حالانکہ غور کرو تو نوّے فیصدی بیمار ایسے آتے ہیں جن کے متعلق تم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہو کہ اگر پرہیز کرتے تو بیماری کیوں بڑھتی! اگر احتیاط برتتا تو یہ حالت کیوں ہوتی۔ یعنی ان نوے فیصدی بیماریوں میں لوگوں کی جہالت ذمہ دار ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود تم ان کے علاج کا انتظام کرتے ہو۔ یہ کہکر نہیں چھوڑ دیتے کہ جاؤ۔ اپنی جہالت کا خمیازہ بھگتو۔ یہی حالت گاؤں والوں کی جہالت کی ہے۔ وہ جہالت سے یہ کچھ کر لیتے ہیں۔ لیکن سوچو کہ ان کی اس جہالت کے نتائج و عواقب کا کوئی مداوا بھی تم لوگوں نے سوچا ہے! اول تو ان کی جہالت بھی اس لئے ہے کہ تم نے اسے رفع کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ اس لئے غور کرو تو اس کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔ پھر تم جب جسمانی بیماروں کی جہالت کے نتائج کی چارہ سازی میں یوں دوڑ دھوپ کرتے ہو۔ تو کیا ان ذہنی بیماروں کی جہالت کے عواقب کے متعلق اتنا کہدینے سے بری الذمہ ہو سکتے ہو کہ انہوں نے ایسی جہالت کیوں برتی؟ یاد رکھو سلیم! جب تک تم شہروں والے ان انسانوں کو بھی اپنے جیسا نہ سمجھوگے جو تمہارے رزق کا مجازی ذریعہ ہیں۔ اس وقت تک تمہاری قوم کی حالت نہیں سنور سکتی۔ تمہارا تغافل مجرمانہ ہے۔ اور تمہارا تسامح ہولناک نتائج کا ذمہ دار۔ لیکن تم شہریوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکو! اچھا۔ سلام علیکم

(پرویز)

باب المراسلات

جناب مدیر طلوع اسلام۔ السلام علیکم

ملک برٹش کا راج ہندو کا اللہ والی ہے میاں سلّو کا

مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے دھوکے سے آگاہ کرنے کے لئے جس قدر کوشش آپ نے کی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اللہ آپ کو نیک جزاء دے۔ آپنے بڑے نازک وقت میں ملّت اسلامیہ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ اور مسلمان بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ کہ ڈاکٹر صاحب رحمت اللہ علیہ کی وفات کے بعد مسٹر جناح کا پاکستان کے نظریہ کو لیکر اٹھ کھڑے ہونا اور اس مقصد کی اشاعت کے لئے طلوع اسلام کا جاری ہو جانا کچھ اللہ کی طرف سے ہی تھا۔ ورنہ مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ تو ہمارے سامنے ہے۔

آپ جو کچھ لکھتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں ہوتا ہے۔ جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی جو کچھ فرماتے ہیں وہ سیاست کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن "ہندو کیا ہے اور اس کے ساتھ مل کر مسلمان کیوں ایک قوم نہیں بن سکتے"! یہ اس وقت تک اچھی طرح سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک آپ کو ہندوؤں سے واسطہ نہ پڑے۔ "سانپ بڑی زہریلی بلا ہوتی ہے اس کے پاس نہ جاؤ وہ تمہارا دشمن ہے" یہ لکچر بہت مفید ہے۔ لیکن زہر کسے کہتے ہیں۔ اس کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ سانپ کیسی خطرناک چیز ہے۔ اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو سانپ نے ڈسا ہو۔ اس معاملہ میں معاف فرمائیے۔ نہ آپ کو ذاتی تجربہ ہو سکتا ہے نہ ہمارے سیاسی لیڈروں کو۔ اس کی بابت ہم سرکاری ملازموں سے پوچھئے

جنھیں رات دن ان سانپوں میں رہنا پڑتا ہے۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ ہندو کے ساتھ اتحاد ہو سکتا ہے یا نہیں! ہندو کی ذہنیت کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہمارے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کو جو ہر وقت ہندو مسلم متحدہ قومیت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کچھ دنوں تک کسی ہندو افسر کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے تو عمر بھر کے لئے متحدہ قومیت کو بھول جائیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کو علم ہی نہیں کہ عملی دنیا میں جب ہندو سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ مسلمان کے ساتھ کیا کرتا ہے جب ملک میں ہندو مسلم کشیدگی کے واقعات رونما ہوتے ہیں کہیں فساد ہو جاتا ہے کہیں ہندوؤں کی زیادتیاں بے نقاب ہوتی ہیں۔ تو ان سب کا الزام انگریزوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ یہ قومیت پرست لوگ غوراً کہہ دیتے ہیں۔ کہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ یہاں انگریز بیٹھا ہے۔ انگریز کو نکال دو سب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ سب باتیں ہندوؤں نے مشہور کر رکھی ہیں۔ اور انگریز کی آڑ میں وہ سب کچھ کئے جا رہے ہیں۔ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں۔ وہاں آ کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ انگریز کا کتنا ہاتھ ہے۔ اور ہندو براہ راست کیا کچھ کر رہا ہے۔ یہاں ملازمین کے متعلق تمام اختیارات ہندو افسروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ انگریز کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا اگر کہیں ہوتا ہے تو بالکل رسمی طور پر۔ اس لئے یہاں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہوتا ہے۔ سب ہندوؤں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو کچلنے کے لئے ہندو کیا کیا حربے استعمال کرتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ اس سے وہی واقف ہو سکتا ہے جس کے ساتھ بیتتی ہے۔ میں اس خط میں بھی کیا لکھ سکتا ہوں کہ ہمارے ساتھ کیا گذرتی ہے۔ کاش آپ کو ذاتی تجربہ ہوتا اور اس کے بعد آپ لکھتے تو پھر دنیا دیکھتی کہ ہندو مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کر رہا ہے۔ چند ایک باتیں لکھتا ہوں۔ شاید آپ کچھ اندازہ کر سکیں۔ معاف فرمائیے۔ میری تحریر ایسی ہی ہو گی۔

دفتری حکومت کے قیام کے وقت سے ۱۹۳۵ء تک تمام سرکاری دفاتر میں ہندو ہی ہندو تھے۔ وہ جسے چاہتے ملازم رکھ لیتے۔ جسے چاہتے نکال دیتے۔ مسلمانوں کی مسلسل چیخ و پکار کے

بعد ۱۹۳۵ء میں احکام نافذ ہوئے کہ آسامیاں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پر کی جائیں یعنی ۲۵ فیصدی مسلمان رکھے جایا کریں۔ آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ ہندوؤں کو یہ فیصلہ کس قدر ناگوار گذرا ہوگا۔ اس سے پیشتر وہ سرکاری گدی کے واحد مالک تھے۔ اب اس میں مسلمان بھی چوتھائی کے شریک ہو گئے۔ اس دن سے ہندوؤں کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے اور جونہی کوئی مسلمان ملازم ہو کر آتا ہے۔ ہندو افسر کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اس کی پیشانی کے تیور صاف صاف کہہ رہے ہوتے ہیں کہ۔ اچھا! اس میں تو میں بے بس ہوں کہ تمہیں یہاں آنے ہی نہ دیتا۔ لیکن عمر تو تم نے میرے ہی ماتحت بسر کرنی ہے۔ دیکھوں گا تم کس طرح پنپ سکتے ہو! دفتری زندگی میں ہندو اور مسلمان کے تعلق کی یہ پہلی لکیر پڑتی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے احکام سے پیشتر ملازمتوں میں مسلمانوں کا کیا حصہ تھا! یہی چیز اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ ہندو کس درجہ انصاف پسند واقع ہوا ہے۔ اعداد و شمار کو سامنے رکھئے۔ قریب قریب نوے فیصدی اسامیوں پر ہندو جما بیٹھا تھا۔ یہ ہے متحدہ قومیت کا نظارہ!

ان جدید احکام کی رو سے صرف نئی اسامیوں میں ہندو مسلم نمائندگی کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ وہ بھی اس وقت جب معیار کے مطابق مسلمان امیدوار مل جائیں (معاف فرمائیے میرے لئے انگریزی کے الفاظ کا اردو میں ترجمہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ اس سے میری مراد ہے کہ Qualified مسلمان ملیں تو پھر انہیں لیا جاوے۔ ورنہ ان کی جگہ بھی ہندو ہی سے لئے جائیں) اس لفظ Qualified کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ ہندوؤں کا جہاں جی چاہے کہدیں کہ کوشش کی گئی تھی۔ لیکن معیاری مسلمان ملا ہی نہیں۔ اتنا لکھدینے کے بعد کوئی قانون ان سے نہیں پوچھ سکتا۔ کہ مسلمان کیوں نہیں رکھا! جواب صاف ہے کہ معیار کے مطابق مسلمان ملتا ہی نہیں تو رکھیں کیسے!

اب آگے بڑھیئے۔ ان احکام کی رو سے وہ اسامیاں جو ترقی (Promotion) سے پُر کی جائیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کو حق نمائندگی نہیں مل سکتا۔ ان اسامیوں کو بھرنے کے

لئے عجیب قاعدہ ہے - ایک چیز ہے (Seniority) معلوم نہیں اس کا کیا ترجمہ ہوگا " طولِ ملازمت " اس سے مفہوم ہے - دوسری چیز ہے (Merit) اس کا ترجمہ بھی میرے لئے مشکل ہے - یوں سمجھئے کہ اس سے مفہوم ہے ذاتی جوہر - طولِ ملازمت تو ناپا جا سکتا ہے لیکن یہ "ذاتی جوہر" ایک ایسا معمہ ہے جس کی کوئی تعریف (Definition) ہی نہیں ہو سکتی - نہ ہی اس کے ماپنے اور تولنے کا کوئی معیار ہے - اس کا معیار ہے تو صرف ایک یعنی افسرِ بالا کے سر کی جنبش - انہوں نے فرقِ مبارک کو نیچے اوپر ہلا دیا - تو معیار پر پورا اتر آیا - اور اگر دائیں بائیں ہلا دیا - تو قصہ ختم ہو گیا - اب اس کی نہ کہیں اپیل ہے - نہ کوئی دلیل ہے ہندوؤں کی ملازمت کی عمر " مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے (مسلمان تو ۱۹۳۵ء کے بعد آنے شروع ہوئے پہلے تو خال خال تھے) اس لئے ترقی (Promotion) طولِ ملازمت کے لحاظ سے ہندو کو ملتی جاتی ہے - مسلمان کی باری ہی نہیں آ سکتی لیکن اگر کہیں سوءِ اتفاق سے ایسا ہو گیا کہ طولِ ملازمت میں ہندو مسلمان سے نیچے ہے - تو اب مداری نے نکالا بچہ جمورا یعنی (Merit) وہ لفظ جو آج تک کہیں شرمندۂ معنی ہی نہیں ہو سکا - اب جو حساب کیا گیا تو نتیجہ عیاں ہے -

طولِ ملازمت + ذاتی جوہر
ہندو

یہ ایسی "مساوات" (Equation)[۲] ہے جس کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہو گا یعنی "ہندو" "یہ فطرت کا اٹل قانون ہے - جسے دنیا کی کوئی قوت بدل نہیں سکتی " (معاف فرمائیے الفاظ آپ کے ہیں صرف محل استعمال میرا ہے) نتیجہ یہ کہ جو اسامیاں سب سے نیچے ہوں ان میں تو مسلمان آ جاتے ہیں کہ ہندو اس میں بے بس ہوتا ہے لیکن ان سے اوپر کے دروازے ان پر یکسر بند ہوتے ہیں - ہر "نو گرفتار" شروع میں کچھ عرصہ کے لئے آزمائشی طور پر ملازم رکھا جاتا ہے - اس عرصہ آزمائش کا نام (Probation) ہوتا ہے ہندو امیدواروں کو دیکھئے - تو تین ماہ - چھ ماہ کے بعد مستقل ملازمت کے اہل قرار دیئے جاتے ہیں - اور مسلمانوں کو دیکھئے تو شبِ فراق میں ستارۂ سحری کا انتظار دیکھ رہے ہیں - آپ پوچھیں گے کہ ان باتوں کے فیصلے کس طرح ہوتے ہیں

نہ بھی سن لیجئے۔ جس طرح تھانہ میں شہر کے "ناموں" لوگوں کا ہسٹری شیٹ کھلا ہوتا ہے۔ اسی طرح دفاتر میں ہر ملازم کا ایک اعمال نامہ رکھا جاتا ہے جسے (Character Roll) یعنی چال چلن میٹر کہا جاتا ہے۔ اس اعمال نامہ میں ہر افسر متعلقہ اپنی اپنی رائے درج کرتا ہے۔ پہلا افسر بالعموم سپرنٹنڈنٹ ہوتا ہے۔ آپ شاید اسے نہ سمجھ سکیں۔ بس یوں سمجھئے جیسے قلیوں پر میٹ ہوتا ہے۔ میٹ کو سرکار اکثی ہمیشہ زیادہ دیتی ہے۔ اب حرام ہے جو یہ خدائی فوجدار کسی کو تمباکو پینے کی بھی مہلت دے۔ سپرنٹنڈنٹ سے اوپر افسر لوگ ہیں۔ نیچے سے اوپر تک سب ہندو قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اعمال نامہ میں کوئی چیز اس کے خلاف درج کیجائے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس کی اپیل کرے لیکن ہمارے برادرانِ وطن کسی مسلمان کے خلاف کیوں لگے لکھنے جو اسے فریاد کا موقع مل جائے۔ وہ اس میں لکھیں گے۔ کہ کام تسلی بخش "(Satisfactory) ہے اور اس کے ساتھی ہندو کے متعلق "بہت عمدہ (Excellent) اب جس کے متعلق تسلی بخش لکھا ہے۔ اسے نہ شکایت کا موقعہ ہے نہ اپیل کا حق اس لئے کہ اس کے خلاف تو کچھ نہیں لکھا گیا۔ کبھی نظرِ کرم کا التفات زیادہ بڑھ گیا تو اتنا اضافہ اور بھی ہو جاتا ہے کہ "کام تسلی بخش ہے۔ البتہ ابھی ناپختگی ہے۔ تھوڑے عرصہ کی نگرانی اور تجربہ کے بعد ٹھیک ہو جانے کی توقع ہے" اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ اس مسلمان کا کام افسرانِ بالا میں سے کسی غیر ہندو کے پاس بھی جاتا ہو تو ایک حربہ اور بھی موجود ہے۔ یعنی یہ الزام کہ یہ شخص خود دار (یعنی گستاخ) ہے اس کے لئے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہے نہ دلیل کی۔ اور چونکہ غالباً حکیم افلاطون کہیں لکھ گیا ہے کہ جب کبھی ماتحت اور افسر میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو تو ہمیشہ افسر کو سچا سمجھو کہ وہ انسانوں کی بستی کا باشندہ نہیں ہوتا جس سے کبھی خطا یا فروگذاشت کا احتمال ہو۔ بلکہ وہ دیوتاؤں کے ملک سے اترا ہوا سمجھا جاتا ہے کہ جو ہر قسم کی غلطی سے منزہ اور تمام انسانی جذبات (مثلاً غصہ انتقام۔ خودغرضی۔ تعصب) سے معرہ ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی افسر کسی ماتحت کے متعلق لکھدے۔ کہ یہ گستاخ ہے تو ماتحت بیچارا سجدۂ نیاز کے ہزار داغ جبیں دکھاتا پھرے

سمجھا ہمیشہ افسر ہی سمجھا جائے گا - اب جس وقت ترقی کا موقع آتا ہے تو اس مسلمان اور اس کے رفیقِ کار ہندو کے اعمالنامے آمنے سامنے رکھے جاتے ہیں (یعنی اس وقت جب مسلمان "طولِ ملازمت" کے اعتبار سے بڑا بھائی ہو) اور فطرت کے اسی اٹل قانون سے ۔ اس "مساوات" کا حل دریافت کیا جاتا ہے ۔ کہ

طولِ ملازمت × ذاتی جوہر
۲

تو آکاش سے آواز آتی ہے - ہندو - اور در و دیوار سے صدائے بازگشت اٹھتی ہے - ہندو! اب ہندو افسر خود فیصلہ نہیں کرتا - بلکہ اوپر کسی انگریز کے پاس بھیج دیتا ہے - وہ ان "اعمالناموں" کو دیکھتا ہے اور نہایت عدل و انصاف سے ہندو کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے اس فیصلہ کی نہ کوئی اپیل ہے نہ ہندو کے خلاف وجہ شکایت بلکہ ہندو افسر بلا کر کہہ دیتا ہے کہ "مسٹر میں نے تمہارے لئے بہت کوشش کی لیکن **صاحب** نہیں مانا - خیر آئندہ مرتبہ سہی" اور ساری عمر یونہی ایڑیاں رگڑتے گذر جاتی ہے ۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسرے دفتر میں نسبتاً بہتر حالات دکھائی دیتے ہیں اور یہ تنگ آیا ہوا مسلمان وہاں جانے کی کوشش کرتا ہے - کوشش بارآور بھی ہو جاتی ہے - لیکن آپ کہیں گے کہ اب لیکن کیا ۔ یہ جانا چاہتا ہے - وہ لینا چاہتے ہیں - اب مشکل کیا ہے؟ لیکن محترمی اخوندزادہ صاحب! آپ اس کائنات کے اسرار و خفایا کا حال کیا جانیں! قانون یہ ہے کہ اپنے دفتر کی اجازت کے بغیر یہ کہیں نہیں جا سکتا - حتیٰ کہ استعفٰی دے کر بھی نہیں جا سکتا - قرآن شریف میں کہیں لکھا دیکھا ہے - کہ جب دوزخی جہنم سے باہر نکلنا چاہیں گے تو جہنم کے فرشتے انہیں پھر اندر دھکیل دیں گے - اور وہ اس جہنم سے کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے - ایسے ہی ایک مسلمان کے لئے دفتر کی زندگی جہنم ہے - وہاں رہتا ہے تو ہر وقت آگ کے شعلوں میں جلتا ہے - نکلنا چاہتا ہے تو باہر نکلنے نہیں دیتے - اس میں یہ نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے (یہ بھی کہیں قرآن شریف میں لکھا ہے) غالباً اسی لئے دوزخ کے داروغہ کا نام **مالک** ہے - یہ ہے ہماری زندگی - اور اس

کے مقابلہ میں ہندو! آج اس دفتر میں۔ کل اس میں جہاں جی چاہے جاؤ۔ جہاں جی چاہے رکو۔ ایسی ایسی نظیریں موجود ہیں کہ پانچ پانچ سات سات برس کے اندر ایک کلرک ہزار ہزار روپیہ کی آسامی تک پہونچ گیا۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے ماتحت ایک مسلمان کو کام کرنا پڑتا ہے اس کا ملازمت میں داخل ہونا برادران وطن کے گھروں میں صف ماتم بچھا دیتا ہے۔ رفقائے کار میں سے کوئی تعاون کرنے پر آمادہ نہیں۔ نیچے سے لیکر اوپر تک تمام افسروں کی یہ حالت کہ لب پر تبسم اور آستینوں میں زہر آلود نشتر کام کی بھرمار۔ دن رات کی محنت شاقہ کے باوجود کہیں سے حوصلہ افزائی نہیں۔ بلکہ ہر وقت ڈانٹ کا خوف۔ کام وقت پر ختم کر کے دفتر سے چلا آتا ہے تو کہدیا جاتا ہے کہ کام میں دلچسپی نہیں لیتا، دیر تک بیٹھکر کام ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو سست اور کاہل ہونے کا الزام دھر دیا جاتا ہے۔ آزادئ رائے سے کچھ لکھتا ہے۔ تو گستاخ اور آئینِ نیازمندی سے بے بہرہ قرار دیا جاتا ہے۔ دبے ہوئے چلتا ہے۔ تو کہدیا جاتا ہے کہ **بداعت** (Initiation) کا مادہ نہیں (معلوم نہیں اس کا ترجمہ صحیح ہوا ہے یا نہیں)۔ غرضیکہ کیا بتاؤں کہ اس پر عرصۂ حیات کس طرح تنگ کیا جاتا ہے۔ مسلمان تو کچھ سخت ہڈی کا واقع ہوا ہے۔ جو ان نامساعد حالات کے باوجود دن گذار دیتا ہے اور کام میں غلطی نہیں کرتا۔ اگر بھارت ماتا کے ان سپوتوں کو چار دن تک ایسے حالات سے واسطہ پڑے۔ تو نارائن جانے سنیاس دھارن کر کے **بن باس** اختیار کرلیں۔

ہندو کس قدر انصاف پسند ہے اور مسلمانوں کو ان کا حق دینے میں کتنا کشادہ ظرف۔ اس کا اندازہ ایک اور چیز سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کی ۲۵ فیصدی نیابت کا قانون چھوٹی تنخواہوں کی اسامیوں پر نافذ نہیں ہوتا۔ مثلاً چپراسی وغیرہ ان کی تعیناتی افسرِ متعلقہ کی مرضی پر ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چپراسیوں کی اسامی کے لئے امیدواروں کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔ لیکن کسی دفتر کے اعداد و شمار منگا کر دیکھئے کہ سال بھر میں جس قدر اسامیاں پُر کی جاتی ہیں۔ ان میں

مسلمانوں کا کس قدر حصّہ ہوتا ہے۔ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اس معاملہ میں انگریز کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ اس میں ہندو افسر کو کلی اختیار حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں پہونچکر پتہ چلتا ہے۔ کہ جب ہندو کو اختیارات حاصل ہوں گے۔ تو وہ مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرے گا۔ یہ ہیں وہ برادران وطن جن سے مل کر متحدہ قومیت کی تعمیر اور ایک جمہوری حکومت کی تشکیل کے لئے ہم سے وعظ کئے جاتے ہیں۔ ان کی آج یہ حالت ہے جب ہنوز ملک پر انگریز کا قبضہ ہے اور جب ملک پر بھی ان ہی کا قبضہ ہوگیا تو پوچھئے نہیں کہ ان کے جذبات کے شعلے کس قدر بھڑک اٹھیں گے۔ کانگریسی لیڈر آئے دن پوچھتے رہتے ہیں کہ بتاؤ تو سہی مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے خلاف کیا شکایت ہے۔ (اور جناب فضل الحق صاحب ان شکایات کی فہرستیں مرتب فرماتے ہیں)۔ میں ان سے باادب عرض کروں گا کہ وہ ایک دن کے لئے کسی سرکاری دفتر میں تشریف لائیں اور پھر دیکھیں کہ ان ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا حشر کیا ہو رہا ہے؟ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا۔ ان حضرات کو معلوم ہی نہیں کہ مسلمانوں پر اس شعبہ میں کیا گذر رہی ہے۔ اگر ہندو ذہنیت کو بے نقاب دیکھنا ہو تو یہ انہی مقامات پر نظر آئے گی۔ ورنہ یوں تو وہ جناب راشٹرپتی صاحب کا میل بھر لمبا جلوس بھی نکال دیں گے اور شری یت ڈاکٹر محمود صاحب کو قلمدان وزارت بھی دے دیں گے۔ یہ لوگ اس میں ہی مگن ہو جاتے ہیں کہ جلوس نکل رہا ہے اور ڈنڈوت ہو رہا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ حقایق کی دنیا میں ہندو کے چھپے ہوئے ناخن کس طرح دشنۂ تیز بن کر ہر "شیر افضل" کے سینے میں گھپنے جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ دانی
تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

شاید آپ کے دل میں یہ خیال گذرے۔ کہ افسر تمام کے تمام ہندو ہی نہیں ہوتے۔ اب تو

مسلمان افسر بھی ملازمتوں میں آرہے ہیں۔ وہ ان شکایات کا مداوا کیوں نہیں کرتے! آپ کو کیا بتایا جائے کہ مسلمان افسروں کی بالعموم کیا حالت ہوتی ہے۔ مسلمان افسر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں عمر بھر اپنی جان کی حفاظت کا خوف کھائے جاتا ہے۔ وہ ہر وقت ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے ڈرتے اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں کے گلے پر بیدریغ چھری پھیری جائے۔ چنانچہ آپ یہ سنکر حیران ہوگئے کہ وہ بدترین نقصانات جو ہندو براہ راست مسلمان کو نہیں پہونچا سکتا۔ ان مسلمان افسروں کے ہاتھوں سے پہونچاتا ہے۔ چنانچہ مسلمان افسر کے انتخاب کے وقت ہندوؤں کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ سوال ہوگا کہ وہ ان کا آلۂ کار کسی حد تک بن سکیگا۔ اس قسم کے افسر عام طور پر کامیاب رہتے ہیں اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس ملّت فروشی کا نام "کشادہ ظرفی" اور اس بزدلی کا لقب "رواداری" رکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ افسر بالعموم ملّت اسلامیہ کے بھکاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مقابلہ کے امتحان میں اپنے جوہر ذاتی (Merit) کی بناء پر کامیاب نہیں ہوتے۔ بلکہ جو آسامیاں مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوئی ہیں۔ وہ انہیں بطور نامزدگی (Nomination) ملتی ہیں۔ ان کی حالت مسلمان "قومیت پرستوں" کی سی ہے جو مسلمانوں کے نمایندے ہونے کے مدعی ہوتے ہیں لیکن دراصل اپنے ذاتی مفاد خاطر ہندوؤں کے آلۂ کار بنے ہوتے ہیں۔

آپ کہیں گے۔ کہ اس کا الزام تو خود مسلمانوں کے سر آتا ہے۔ ہندوؤں کے خلاف اس کی شکایت کیسی؟ بظاہر یہی نظر آتا ہے۔ لیکن سوچئے کہ جو قوم اپنی قوت اور دولت کے بل بوتے پر قوم مخالف کی "کالی بھیڑوں" کو اپنے ساتھ ملاکر اسی قوم کے سلب (EXPLOITATION) میں ذرا دریغ نہ کرے۔ اس قوم کی ذہنیت اس قابل ہے کہ کوئی قوم اس کے زیر سایہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھے؟

دوسری قسم کے مسلمان افسر وہ ہیں جو دل میں قوم کا درد لیکر آتے ہیں اور حق و انصاف کو اپنا مسلک قرار دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان افسروں کے خلاف جس قدر پروپیگنڈا ہندوؤں کی

طرف سے ہوتا ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے ایسے افسر کی آمد کی خبر سن کر اندر باہر ہر جگہ کائیں کائیں شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گئے لٹ گئے۔ مسلم راج قائم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا۔ اتنا شور کہ وہ بیچارہ آتے ہی بوکھلا جائے۔ اور انگریز افسر پہلے ہی متاثر ہو جائیں کہ واقعی کوئی "محمود غزنوی" آ رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی ہر تجویز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ فرقہ پرست مشہور ہو کر عمر بھر چکر میں پڑا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ دنیائے عمل۔ جہاں پہونچکر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ہندو اپنے اصلی رنگ میں کیا ہے۔ اور یہ کبھی بھی مسلمان کو اپنے ساتھ ملا سکتا ہے؟ ایسی قوم کے ساتھ متحدہ قومیت سے اگر خودکشی نہیں تو اور کیا ہے۔

معاف فرمائیے۔ خط بہت طویل ہو گیا لیکن خط کیا ہے سینے کے کچھ داغ ہیں جنہیں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے۔ کہ ہم گورنمنٹ سرونٹ آپ حضرات کی نگاہ میں کچھ ایسے ذلیل سمجھے جاتے ہیں کہ ہماری کسی بات کو لائق التفات ہی قرار نہیں دیا جاتا۔ لیکن میں کم از کم آپ سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

آپ کے قیمتی وقت میں حارج ہونے کے لئے خواستگار عفو ہوں۔ والسلام"

[برادرم۔ ہم نے تو کبھی کسی صحیح الخیال مسلمان کو حقیر نہیں سمجھا۔ البتہ جو دیدہ دانستہ ملت فروشی پر اڑ جائیں ان کے متعلق ہماری روش ظاہر ہے۔ باقی رہا آپ کا طبقہ۔ سو جس "گروہ" میں ہمیں جناب **پرویز** اور حضرت **اسد** ملتانی جیسے **"شہسوار"** ملیں اسے حقیر سمجھنا اپنی کور ذوقی کا ثبوت دینا ہے آپ کے شکر گذار ہیں کہ جن تفاصیل سے آپ نے مطلع فرمایا ان سے واقعی ہمیں ذاتی طور پر علم و تجربہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اصولی طور پر ہمیں یقین ہے کہ ہندو کسی شعبۂ زندگی میں بھی مسلمان کا ہی خواہ نہیں ہو سکتا کہ یہ چیز ذہنیت سے تعلق رکھتی ہے۔ شعبوں سے نہیں۔] (طلوع اسلام)

مکرّاسلہ

(۲)

علمُ حدیث

مکرمی جناب مرتب صاحب - السلام علیکم - طلوع اسلام میں احادیث کے بارے میں جو سلسلۂ مضامین نکلا ہے - میں اس کو موضوع کی اہمیت کی بنا پر نہایت غور سے پڑھتا رہا ہوں - خاص طور پر مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری کا وہ مضمون جو مئی کے پرچے میں نکلا - لیکن ان مضامین سے جو نتائج آپ نے اگست کے "لمعات" کے اندر مرتب کئے ہیں وہ بعض پہلوؤں سے مزید وضاحت چاہتے ہیں -

آپ کے نزدیک اسلام میں یقینی چیز قرآن کریم اور عمل متواتر ہے لہٰذا یہ دونو تو دین ہیں لیکن احادیث دین نہیں بلکہ دینی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہیں -

سب سے پہلے تو لفظ "دین" کی توضیح ہونی چاہیئے - اگر دین سے مراد ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو تو یقیناً قرآن کریم کو دین کی بنیاد قرار دے کر وسیع پیمانہ پر نظامِ دینی کی تشکیل ضروری ہو گی - اس صورت میں کیا اس وسیع نظام کے تمام اجزاء پر لفظ "دین" کا اطلاق ہو سکے گا یا نہیں ؟ اگر نہیں ہو سکے گا تو پھر دین ایک محدود چیز رہ جائے گی اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی نہیں ہو سکے گی - نظامِ معاشرت کو دینی اور دنیوی یا دینی اور غیر دینی حلقوں میں تقسیم کرنا پڑے گا - یہ تقسیم یقیناً اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے لہٰذا درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام اجزاء پر دین کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے اس صورت میں ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ بہت کچھ دین کے دائرے میں لانا پڑتا ہے - یہ قرآن میں اضافہ کی نہیں بلکہ اس کی روشنی میں عملی تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے - یہ سب کچھ اصولی نہیں بلکہ فروعی ہوتا ہے یہ قرآن کی طرح حتمی اور ناقابلِ تبدیل نہیں ہو سکتا بلکہ حسبِ ضرورت اس میں ردوبدل بھی ممکن ہوتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ یقیناً

دین ہے اور اسے دین کے دائرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا ورنہ دین کی ہمہ گیری قائم نہیں رہتی۔

البتہ دین کے ان دو حصوں کی تفریق "الدین" اور "دین" کے الفاظ سے کیجاسکتی ہے۔ "الدین" بنا بر آیہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قرآن اور صرف قرآن ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ باقی تفصیلات محض "دین"۔ "الدین" اصل ہے اور "دین" اس کی فرع۔ یقیناً دین کی تشکیل قرآن کریم کے بتائے ہوئے خاکے کے مطابق ہوگی لیکن اس کے مطابق جو عمارت تیار ہو وہ اپنے تمام اجزا کے ساتھ دین ہوگی۔

غالباً اسی بنا پر آپ نے بھی یقینی دین کو صرف قرآن پر مشتمل نہیں سمجھا بلکہ اس پر "عمل متواتر" کا اضافہ ضروری خیال کیا ہے گویا آپ نے یہ تسلیم کرلیا کہ دین کے لئے قرآن کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہے اسے اسوۂ حسنہ کہا جائے یا سنت یا تواتر عمل بہرحال مطلب ایک ہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس عمل متواتر کو آپ یقینی اور جزو دین قرار دیتے ہیں اگر عین اسی عمل کو احاطۂ تحریر میں لادیا گیا ہو تو اسے یقینی اور جزو دین کیوں نہ سمجھا جائے؟ بالخصوص جب کہ اس تحریری روایت آنحضرت صلعم سے بھی منسوب ہو۔ بالفرض اس کی سند یقینی نہ سہی۔ روایت کا بالّلفظ صحیح ہونا ثابت نہ سہی لیکن اگر وہ روایت عملِ متواتر کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہو تو کیا وجہ ہے اسے دین قرار نہ دیا جائے؟

مولانائے محترم نے اپنے مضمون میں ایک جگہ موضوع حدیثوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "اس جھوٹ کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح تھیں اس طرح مخلوط ہوگئیں کہ..."

گویا احادیث میں سے بعض کی "بلاشبہ صحت" کا امکان تسلیم کرنا پڑا ہے ایسی صورت میں وہ احادیث جو روایت کی رو سے غیر معتبر نہ ہوں کسی نصِ صریح کے خلاف نہ جائیں اور عملِ متواتر کے عین مطابق ہوں تو ان کو صحیح اور یقینی مان لینے میں کیوں تامّل ہونا چاہیئے؟

آپ عمل متواتر کے یقینی ہونے کے لئے یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ "نبی اکرمؐ سے لیکر آج تک امّت میں نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہو" اب اس کا کیا ثبوت کہ کوئی عمل واقعی نبی اکرمؐ سے اس وقت تک متواتر چلا آیا ہے؟ لہٰذا خود تواتر عمل جسے آپ یقینی ٹھیراتے ہیں بغیر کسی سند کے

قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتا۔ بہت سے اعمال میں خواہ وہ فروعی سہی اختلاف پڑ چکا ہے۔ بہت سی دینی رسمیں مسلمانوں کی عملی زندگی میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کی چھان بین ضروری ہو گی۔ چونکہ یہ اختلافات عموماً فروعی جزئیات میں ہوتے ہیں اس لئے قرآنِ کریم سے ان کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکتی لامحالہ پیغمبر صلعم کے اُسوۂ حسنہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جس کے لئے احادیث کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

عمل متواتر مجموعی طور پر عالم اسلام کا خواہ کچھ ہو مقامی طور پر اس میں بہت کچھ اختلافات ہو سکتے ہیں مثلاً ایک مسلمان جو کسی ایرانی شہر میں پیدا ہوا اور عمر بھر وہیں رہا اس کے پیش نظر نماز روزہ اور تعزیہ داری وغیرہ میں وہاں کا رواج عملی تواتر کی حیثیت رکھے گا خواہ باقی دنیائے اسلام کا طرز عمل مختلف کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت میں محض عملی تواتر پر اعتماد کر لینا یقیناً کافی نہیں ہو سکتا اور عمل متواتر کی صحت کے لئے ضرور کوئی معیار مقرر کرنا پڑے گا۔ یہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے احادیث کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن زیادہ تر اصول پیش کر کے جزئیات میں اسوۂ حسنہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔

اگر ہر عملِ متواتر کو بلا تحقیق یقینی مان لیا جائے تو کیا یہ "اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ" کی زد میں نہ آ جائے گا؟ یہ کہہ دینا کہ عملِ متواتر کے یہ اختلافات محض فروعی حیثیت رکھتے ہیں اور چنداں قابلِ اعتنا نہیں تسلی بخش جواب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بالعموم اصولِ دین میں اسلام کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات بہت کم ہیں۔ اختلاف اور افتراق کی بنیاد زیادہ تر انہی فروعی باتوں پر ہے لہٰذا ان کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں جہاں ایک طرف بہت سے دینی اعمال کا متواتر ہونا یقینی نہیں وہاں دوسری طرف بہت سے ایسے دینی اعمال بھی ممکن ہیں جو مرورِ زمانہ سے منقطع ہو چکے ہوں مثال کے طور پر مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے درہم برہم ہو چکی ہے۔ ہمارے پاس خلافت۔ مجلس شوریٰ اور جماعت کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ ان کے بنیادی اصول یقیناً قرآن کریم میں مل سکتے ہیں لیکن تفصیلی جزئیات کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ مانا کہ ہم محکمات قرآنی کے علاوہ باقی جزئیات

ضرورت زمانہ کے مطابق خود بھی مقرر کر سکتے ہیں لیکن اجتہاد سے پیشتر جہاں تک ممکن ہو ہم زمانۂ نبویؐ کے عملی طور پر کامیاب نمونہ سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں؟ اور جب اس بارے میں عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ جیسے انتہائی انسانی کوشش کی حد تک معتبر ارشاداتِ نبویؐ مل سکتے ہیں تو ان کو دین سے کیوں خارج کر دیں؟

ان حالات میں خالص دینی ضروریات کے لئے احادیث سے کوئی مفر نظر نہیں آتا۔ البتہ حدیث کے متعلق جس قدر تحقیقات پیش کی گئی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ حسب ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں :-

(۱) دین یقینی شے ہے قیاسی اور ظنی شے دین کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

(۲) اسلام میں یقینی چیز :-

(ا) قرآنِ کریم ہے جو اپنے اصلی الفاظ میں بلاشک و شبہ ہمارے پاس موجود ہے اور قیامت تک اسی طرح موجود رہے گا

(ب) وہ عملِ متواتر ہے جس کے نبیؐ اکرم سے لیکر آج تک امّت میں نسلاً بعد نسلٍ چلے آنے کی انتہائی انسانی کوشش کی حد تک معتبر سند مل سکتی ہے۔

(۳) احادیث ظنی ہیں۔ قرآن کی طرح یقینی نہیں ہیں اس لئے ان پر دین کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی لیکن

(۴) وہ احادیث جو انتہائی انسانی تحقیق کی حد تک معتبر ہوں۔ امّت کے متواتر عمل سے ان کی تصدیق ہوتی ہو اور وہ قرآن کے خلاف نہ ہوں بلاشبہ صحیح سمجھی جا سکتی ہیں اور ان کو دین کے فروعی اجزا کی حیثیت دئے بغیر چارہ کار نہیں امید ہے کہ آپ کو مندرجہ بالا نتائج سے اختلاف ہوگا ممکن ہے بہت سے اصحاب کے دل میں بھی یہی شبہات پیدا ہوئے ہوں جو اوپر ظاہر کئے گئے ہیں لہٰذا اگر مناسب سمجھیں تو ان سطور کو طلوع اسلام میں شائع کر کے جواب سے مستفید فرمائیں۔ والسلام (نیازمند اسد ملتانی)

[ہمارے محترم جناب اسد ملتانی نے جو مندرجہ بالا نتائج پیش کئے ہیں وہ ہمارے نزدیک

بالکل صحیح ہیں حدیثیں جو قرآن کریم کے مطابق ہوں گی۔ قبول کی جائیں گی۔ چنانچہ علامہ اسلم جیراجپوری صاحب نے بھی اپنے مضمون "علم حدیث" میں اس کی تصریح فرمادی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ

"حدیثیں جو قرآن کریم اور عمل متواتر کے مطابق ہوں گی قبول کی جائیں گی بلکہ وہ بھی جو ان کے خلاف نہ ہوں"۔

اور جناب پرویز صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اس امر کی صراحت فرمادی ہے کہ "اس قسم کی تنقید و تنقیح کے بعد احادیث کے ان مجموعوں سے ہم دین کے سمجھنے میں اور جزئیات کی تشکیل میں استفادہ حاصل کرسکتے ہیں"۔ لیکن اصل نقطۂ بحث قبولیت یا عدم قبولیت نہیں۔ بلکہ حجیت حدیث ہے۔ یعنی جبکہ حدیثیں ظنی اور غیر یقینی ہیں تو دینی معاملات میں وہ حجت کے طور پر (یعنی بطور دلیل و سند) پیش نہیں کی جاسکتیں۔ ان کی قبولیت صرف قرآن کریم یا عمل متواتر کی موافقت ہی کے باعث ہوسکتی ہے۔ ہم نے جو حدیثوں کے دینی ہونے کا انکار کیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ وہ دین میں حجت نہیں ہیں۔ جیسا کہ علامہ موصوف نے اپنے مقالہ کے اخیر میں لکھا ہے۔

"حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ پیش نہیں کی جاسکتی"۔

احادیث کے متعلق ہم نے جو کچھ شائع کیا ہے اس سے ایک عام غلط فہمی یہ پیدا ہوئی۔ یا پیدا کی گئی ہے۔ کہ ہم حدیثوں کا بالکل انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ ان کے غیر یقینی ہونے کے باعث صرف ان کے دینی حجت۔ یعنی دین کے معاملات میں بطور دلیل کے پیش کرنے کا انکار ہے۔ امت اسلامیہ کو جس روایت پرستی سے نقصان پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ ہر دینی معاملہ میں حدیثیں بطور حجت کے پیش کی جانے لگیں اور قرآن کریم حجاب میں آگیا۔ اس حجاب کو اٹھا دینا ہمارے پیش نظر ہے اور یہی ہمارے محترم مقالہ نگار حضرات کا مقصد ہے قرآن کریم اور عمل متواتر کے موافق احادیث کی قبولیت اور ان کی افادیت سے نہ ہمیں انکار ہے نہ ان حضرات کو۔

جناب اسعد صاحب نے جن دوسرے گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ صدر

تفریح کے بعد ان کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی - وہ از خود حل ہو جاتے ہیں - تواتر کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس عمل کا حکم قرآن کریم میں موجود ہو اس شرط کو پیش نظر رکھنے سے وہ اشکال خود بخود رفع ہو جائیں گی جن کی طرف اسد صاحب نے اشارہ فرمایا ہے - باقی رہا تواتر عمل میں موجودہ فرعی اختلافات - سو ان کے متعلق جناب پرویز صاحب نے اپنے مضمون میں بحث کی ہے اور ایک امکانی حل تجویز کیا ہے - جو قرآنی حکومت کے قیام کے بعد عمل میں آسکتا ہے - اُس وقت تک سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ہم معتقدات میں قرآنی بنیادوں کے مطابق وحدتِ افکار پیدا کرتے جائیں اور تواتر میں موجودہ فرعی اختلافات سے بحث نہ کریں - جناب اسد صاحب نے جو یہ فرمایا ہے کہ عملِ متواتر کے یقینی اور قطعی ہونے کے لئے کسی روایتی سند کی ضرورت ہے تو انہوں نے اس چیز کو نظر انداز فرما دیا ہے کہ عملِ متواتر کے ہر فرعی اختلاف کے لئے روایتی سند موجود ہے اس لئے آپ کس سند کو یقینی اور کسے غیر یقینی قرار دیں گے ؟ [طلوع اسلام]

تپ دق کی طرح "پائریا" کے تین درجے ہیں

اوّل - دانتوں کی عام تکالیف اور مسوڑھوں سے کبھی کبھی خون کا آنا **دوم** مسوڑھوں میں پیپ کا پڑ جانا **سوم** پیپ اور خون کی زہریلی نجاستوں سے معدہ کا ماؤف ہو کر جسم میں صدہا خطرناک امراض کا نمودار ہونا -

اور دردبھری حسرتناک موت

"پائریا" کا علاج آسان نہیں اور بلا سمجھے کسی دوا کا استعمال اور بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے - لیکن آپ ابھی تک محفوظ ہیں یا خدانخواستہ کسی درجے میں ہیں - دانت اور مسوڑھوں کی کوئی تکلیف ہو ہم دنیا بھر میں واحد قطعی حکمی اور مکمل سائنٹفک علاج کے لئے آپ کو وہ آسان طریقہ بتلائیں گے جس کو آپ کا دل تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گا -

مہربانی فرما کر بذریعہ کارڈ اپنے پتہ سے اطلاع دیں

حاتی جیا انڈسٹریز (انڈیا) ، انبالہ چھاؤنی

حقائق وعبر

(۱) کچھ اربابِ جامعہ سے

رسالہ جامعہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۰ء میں جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی کا ایک مضمون بہ عنوان "ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن" شائع ہوا ہے۔ مضمون بہت عمدہ ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ تمدن کسی خاص وضع قطع کے لباس یا مخصوص آدابِ معاشرت کا نام نہیں بلکہ اس کی اساس ذہنیت پر ہے۔ جسے ہم اسلامی تمدن کہتے ہیں وہ دراصل ایک مخصوص اسلامی ذہنیت کا نام ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو اس مخصوص اسلامی ذہنیت سے بیگانہ رکھنے کے لئے ملک میں تحریکِ آزادی کے پردے میں کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں آپ فرماتے ہیں۔

ہمارے سیاسی لیڈر اب صرف آزادی ہی نہیں چاہتے ہیں وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے سیاسی معاشی اور معاشرتی نظریات ہندوستان کی پوری آبادی پر مسلط کر دیں۔ وہ ایک خاص نظام تصورات (Ideology) کے داعی اور مبلغ بن گئے ان کی خواہش ہے کہ ہر فرد قوم بلا امتیاز نسل و مذہب اسی نظام تصورات کو قبول کرے۔ یہاں پر ہمارا اسلامی ذہن درمیان میں آجاتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنا ایک جداگانہ نظام تصورات رکھتا ہے جس کے علاوہ کسی دوسرے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لئے راضی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عدم تشدد کے عقیدہ کو لیجئے۔ بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم میں اس عقیدہ کو بھی تعلیم کا ایک جزو قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہر طالب علم کو جو اس اسکیم کے تحت تعلیم حاصل کرے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس عقیدہ پر ایمان لانا پڑے گا کہ عدم تشدد تشدد سے بہر حال بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ طالب علموں پر اس عقیدہ کی نسبت کوئی جبر کیا جائے گا لیکن جب انہیں تعلیم ہی یہی دی جائے گی کہ عدم

تشدد سے اعلیٰ تر اصولِ زندگی کوئی نہیں ہے تو انہیں غیر شعوری طور سے اس کی صداقت پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی ذہن سے کلی مغائرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس عقیدہ کی بھی تلقین کی جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اور کسی ایک مذہب کے پیروں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب سے فائق و برتر خیال کریں۔ جہاں تک مسلمان لڑکوں کا تعلق ہے ان کے لئے اس تعلیم میں یہ خطرہ ہے کہ ان میں سے اسلام و کفر کے امتیاز کا ضروری احساس مٹ جائے گا آگے چل کر میں یہ بتاؤں گا کہ اس امتیاز کو برقرار رکھنا مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے لئے کیوں ضروری ہے۔"

بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہی ہے جسے عرفِ عام میں "وارد ہا اسکیم" کہتے ہیں اور جس سے قارئین طلوعِ اسلام اچھی طرح واقف ہیں[1]۔

یہ اسکیم گاندھی جی کی راہ نمائی میں جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مرتب فرمائی تھی اور مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی تھی حتیٰ کہ جمعیت العلماء ہند جیسی قومیت پرست جماعت نے بھی اس کے خلاف ریزولیوشن پاس کیا تھا اگرچہ اس پر عملاً ابھی کچھ نہیں ہوا)۔ اس اسکیم میں اصولی طور پر بھی دو باتیں تھیں جن کا تعلق اسلام سے ہے اور ان کے متعلق جناب صدیقی صاحب نے واضح الفاظ میں لکھدیا ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی ذہن سے کلی مغائرت رکھتا ہے اور اس تعلیم سے مسلمان بچوں کے ذہن سے اسلام و کفر کے امتیاز کا ضروری احساس مٹ جائے گا۔ رسالہ جامعہ نے اس مضمون کو بغیر کسی تردیدی یا اختلافی نوٹ کے شائع کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ جناب صدیقی صاحب کے مصروحہ بالا نتائج سے متفق ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا ہم اربابِ جامعہ سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ وہ تعلیم جو اسلامی ذہنیت پر اس درجہ مضر اثر ڈالنے والی ہے خود جامعہ ہی کی آغوش میں کیوں پرورش پا رہی ہے! اسکیم۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ خود جناب شیخ الجامعہ کی مرتب فرمودہ ہے۔ اور جہاں تک ہمارے علم میں ہے انہوں نے کبھی اس سے اپنی برأت کا اعلان

---

[1] ملاحظہ ہو پمفلٹ "وارد ہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" شائع کردہ طلوعِ اسلام۔

نہیں فرمایا۔ "پھر استادوں کا مدرسہ" جہاں اس اسکیم کے درس و تدریس کے لئے معلمین تیار کئے جاتے ہیں جامعہ ہی کی زیر نگرانی قائم ہے پہلے جامعہ سے ملحق قرول باغ میں تھا اور اب جامعہ نگر (اوکھلا) میں زیر تعمیر ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مدرسہ کے پرنسپل جامعہ ہی کے ایک استاد ہیں جو جامعہ کے "بچوں کے مدرسہ" کے نگراں بھی ہیں۔ اور اگر جامعہ کے ارباب حل و عقد کے نزدیک اس اسکیم میں کوئی ایسی خرابی نہیں جس کا ذکر جناب صدیقی صاحب نے فرمایا ہے تو اس امر کی وضاحت فرمادی جائے تاکہ کوئی مغالطہ میں نہ رہے۔

---

(۲) آمد مسیح موعود" کے قرآنی نشانات

اسٹیٹمین بابت ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء میں قادیانی جماعت اور ان کے خلیفہ صاحب کے متعلق ایک طول طویل لیکن دلچسپ بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ خلیفہ صاحب کے مریدین میں سے بعض کو خواب آیا کہ خلیفہ صاحب کی وفات کا وقت آرہا ہے۔ اس پر خلیفہ صاحب نے اپنی وصیت بھی تحریر فرمادی اور

"اس عقیدہ کے ماتحت کہ آنے والی مصیبت، صدقات و خیرات سے ٹل سکتی ہے احمدیہ جماعتوں نے قریب پچاس ہزار روپیہ غربا اور محتاجوں میں تقسیم کیا ہے۔"

یہ خیرات اس موت کی مصیبت کو ٹالنے کے لئے ہے جس کے متعلق قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ کہ اس کے وقت معیّن میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ وہ موت جسے ایک مومن "تقریب بہر ملاقات" سمجھ کر اس سے عروس نو کی طرح ہمکنار ہونے کی تمنا رکھتا ہے۔ قرآن کریم نے تو سچے اور جھوٹے کی پہچان ہی یہ بتائی ہے کہ ایک سچا مومن موت سے نہیں ڈرتا۔ یہودیوں سے یہی کہا گیا تھا کہ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (اگر سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے بتاؤ) لیکن جن کے ہاں جہاد ہی حرام ہو چکا ہے وہ موت کی لذت کو کیا جانیں۔ موت کی لذت پوچھئے کسی مسلمان سے کہ۔

چو مرگ آید تبسم برلب اوست

پھر اس بیان میں مذکور ہے کہ جنگ کے شروع سے مرزا صاحب برطانوی افواج کی فتح و نصرت

کے لئے جمعہ کے روز خاص طور پر دعا مانگتے ہیں۔ انہیں برطانیہ کے برسرِ حق ہونے کا یقین ہے۔ حال ہی میں جمعہ کے ایک اجتماع میں انہوں نے اعلان کیا کہ انگریزوں کی فتح یقینی ہے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ حکومت انہیں اس امر کے لئے مجاز قرار دیدے کہ وہ ان کی طرف سے دعا کا اہتمام کیا کریں۔

معلوم نہیں "خدائے قادیان" کی عدالت میں دعا مانگنے کے لئے خلیفۂ قادیان کو اس "مختار نامہ" کی کیا ضرورت ہے۔

خلیفہ صاحب کے متعلق تحریر ہے :-

"مرزا صاحب نے چھ عورتوں سے شادی کی ہے جن میں سے چار زندہ ہیں۔ وہ بائیس بچوں کے باپ ہیں۔ تیرہ لڑکے اور نو لڑکیاں۔ مضبوط جسم۔ رنگ نکھرا ہوا۔ مذاق میں سادگی تجربہ علمی۔ موجودہ عالمگیر مسائل پر کافی عبور حاصل ہے اور ان کی نیم باز آنکھیں ایک (مقدس) مذہبی روح کے سکون و طمانیت کی آئینہ دار ہیں"

پھر تحریر ہے :-

"ہندوستان میں فرقہ وارانہ مصالحت کے پیش نظر حضرت مسیح موعودؑ نے اپنے ایک پیغام میں ہندوؤں سے کہا تھا کہ وہ ایک عہدنامہ لکھنے پر آمادہ ہیں جس کی رو سے ان کی جماعت ویدوں اور رشیوں پر ایمان رکھے گی اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں مبلغ تین لاکھ روپیہ بطور تاوان ادا کرے گی۔ اس کے بدلے میں ہندو بھی ایک معاہدہ پر دستخط کریں کہ وہ حضرت محمد (رسول اللہؐ) پر ایمان رکھیں گے۔ اس سے دونوں قوموں کی شکر رنجی جاتی رہے گی اور مسلمانوں کی طرف سے گاؤکشی بند ہو جائے گی"

لیکن اس بیان کا حسب ذیل حصہ اور بھی دلچسپ ہے :-

"خلیفہ صاحب نے اسٹیٹسمین کے نامہ نگار سے ملاقات کے دوران میں قرآن کریم کی ان آیات کا ذکر کیا جن میں ایک نئے مسیح کی آمد کا تذکرہ ہے اور انہوں نے بتایا کہ قرآن کریم میں "مسیح موعودؑ" کی آمد کے متعلق کیا کیا حالات لکھے ہیں۔ اور کہا کہ جب "مسیح موعودؑ"

اسلام کو اس کی خرابیوں سے پاک کرنے کے لئے آئے گا تو اس وقت ایک ایسی تیز رفتار سواری وجود میں آئے گی جس کا دھواں ستر گز لمبا ہوگا (اس نے خلیفہ صاحب کی مراد ریل گاڑی تھی)، دوسری نشانی یہ کہ دو بڑے بڑے سمندر آپس میں ملیں گے۔ ان میں سے ایک میں موتی اور دوسرے میں مرجان ہوں گے۔ اور اس طرح ملیں گے کہ پہاڑ جیسے بڑے بڑے جہاز اس میں سے گذر جائیں گے (اس سے نہر سویز مراد تھی) خلیفہ صاحب نے بتایا کہ جس عہد میں مسیح موعودؑ کا ظہور ہوگا اس عہد میں لوگوں کا اخلاق بہت گرا ہوا ہوگا اور پردے کی رسم اٹھ گئی ہوگی۔ اور چوتھی نشانی یہ بتائی کہ مسیح موعودؑ جمعہ کے روز توام پیدا ہوں گے۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ میرے والد کی پیدائش کے وقت یہ تمام نشانات جمع ہوگئے تھے۔"

ہم نے خلیفہ صاحب یا ان کی جماعت کے احوال و کوائف کے متعلق کبھی کچھ دلچسپی نہیں لی کہ یہ اس قابل ہی نہیں ہیں لیکن مذکورہ صدر بیان میں جس دیدہ دلیری سے کام لیکر غیر مسلموں اور ناواقف مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پر خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ ہم نے ۴ ستمبر کو اسٹیٹسمین کو ایک چھٹی لکھی جس میں اوپر کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ۔

"ہم مرزا صاحب اور ان کی وساطت سے تمام جماعت احمدیہ کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی ان آیات کا حوالہ دیں جن میں یہ لکھا ہے کہ مندرجہ بالا نشانیاں "مسیح موعودؑ کی پیدائش کے وقت ظہور میں آئیں گی آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ قرآن کریم میں کسی مسیح موعود کا کوئی ذکر نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی آمد کی نشانیاں مندرج ہوں۔ ہمیں حیرت ہے کہ بعض لوگ اس قسم کے بیانات دینے میں کیسی جرأت سے کام لیتے ہیں یہ لوگ انہیں دھوکا دے سکتے ہیں جنہیں علم نہیں کہ قرآن کریم میں کیا لکھا ہے لیکن وہ مسلمانوں کو بآسانی دھوکا نہیں دے سکتے جنھیں علم ہے کہ قرآن کریم کی کیا تعلیم ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن کریم ایک کتاب مختوم نہیں۔"

یہ خط ۴ ستمبر کو لکھا گیا اور ۱۵ ستمبر تک انتظار کیا گیا لیکن اسٹیٹمین نے اسے شائع نہیں کیا۔ وجوہات ظاہر ہیں چنانچہ اس کے بعد یہ خط جریدہ ایسٹرن ٹائمز۔ لاہور کے نام بھیجا گیا۔ صلہ

ہم ایک مرتبہ پھر جناب "خلیفۃ المسیح صاحب کو چیلنج دیتے ہیں کہ اگر وہ اپنے اس بیان کو صداقت پر مبنی سمجھتے ہیں تو وہ قرآن کریم کی ان آیات سے ہمیں آگاہ کریں جن میں یہ لکھا ہے کہ کسی "آنے والے مسیح کی پیدائش کے وقت یہ نشانیاں ظہور میں آئیں گی ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین قرآن کریم سے "مسیح موعود" کی نشانیاں غالباً اسی طرح سے ثابت کی جائیں گی جیسے ایک لال بجھکڑ نے وکا یزید الظالمین الاخسارا سے ثابت کیا تھا کہ قرآن میں یزید کا ذکر موجود ہے۔

(۳) تادیبی کارروائی

مسلم لیگ کے ان ارکان کے خلاف جو لیگ کے فیصلہ کے باوجود جنگی کمیٹیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ تادیبی اقدام کے لئے طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۴۰ء کے لمعات میں ہم نے وضاحت سے لکھا تھا۔ اب اس موضوع پر مرکزی لیگ کے اخبار منشور بابت ۱۵ ستمبر میں ذیل کا شذرہ شائع ہوا ہے۔

"ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۶ جون ۱۹۴۰ء میں ایک رزولیوشن پاس کیا تھا کہ مسلمان اس وقت تک وار کمیٹیوں میں شریک نہ ہوں جب تک صدر آل انڈیا مسلم لیگ اور وائسرائے کی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ برآمد ہو جائے یہ ممانعت اس لئے کی گئی تھی کہ دو اہم معاملات تصفیہ طلب تھے (۱) یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ اس کا اطمینان دلائے کہ ہندوستان کے لئے وہ کوئی ایسا دستور حکومت منظور نہ کرے گی جس کو مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری حاصل نہ ہو (۲) اہتمام جنگ میں مسلمانوں کا حقیقی اور دلی تعاون حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرکز اور صوبجاتی حکومتوں میں مسلم لیگ کے لیڈروں کو مساوی المرتبہ حصہ دار کی حیثیت سے اختیار اور منصب کے ساتھ شریک کیا جائے۔ مسلم لیگ کے نزدیک وار کمیٹیوں میں مسلمانوں کی شرکت فضول تھی تاوقتیکہ ان مسائل کا مسلم لیگ کی منشاء کے مطابق تصفیہ نہ ہو جائے۔

مسلم لیگ کے دشمنوں نے مسلم لیگ کی اس ممانعت کو حکومت کے ساتھ عدم تعاون سے

صلہ اس میں بھی ابھی تک شریک نہیں ہوا۔

تعبیر کیا یہ بھی غلط تھا مسلم لیگ اس طرح حکومت کو اپنے مقاصد کی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔

لیکن صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے گفتگو اور مراسلت کے بعد ہز ایکسلنسی وائسرائے نے اپنے بیان اور ان کے بعد مسٹر امیرے وزیر ہند نے اپنی تقریر میں ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے پہلے مطالبہ کو تو عملاً بالکل پورا کر دیا اور دوسرے کا اصول مان لیا۔ صرف تفصیلات پر اب گفتگو ہے۔ لہذا مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ اجازت دیدی ہے کہ جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف وار کمیٹیوں میں شرکت کر کے کوئی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں وہ ان میں شریک ہوں۔

مسلم لیگ کے ۱۶ جون ۱۹۴۰ء کے امتناعی رزولیوشن کے متعلق پنجاب اور بنگال کے بعض ارکان لیگ نے اخبارات میں بیان شائع کیا کہ اس امتناعی رزولیوشن سے پنجاب اور بنگال کے مسلمان مستثنیٰ ہیں۔ اس پر صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے فوراً اعلان کیا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان مستثنیٰ نہیں ہیں اور نہایت صاف الفاظ میں فرما دیا کہ اس رزولیوشن میں کسی کے لئے کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ اب بحث کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی صدر کے اظہار رائے کے بعد اس کا کسی کو منصب نہیں ہے کہ کسی رزولیوشن کے متعلق اپنی تعبیر پیش کرے۔

مگر اس پر بعض لیگروں نے وار کمیٹیوں میں شرکت کی۔ پنجاب میں یہ اور مقامات کے مقابلہ میں زیادہ ہوا۔

قرار پایا کہ ان لوگوں کے خلاف ڈسپلنری ایکشن لیا جائے (یعنی تادیبی کارروائی کیجائے) جنھوں نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی خلاف ورزی کی ہے۔ نوٹس دئے گئے اور عملاً بعض صوبہ مسلم لیگوں نے ان لوگوں کے خلاف ڈسپلنری ایکشن لیا جنھوں نے اس خفیف سے معاملہ میں بھی اپنے میلان کے مقابلے میں لیگ کی اطاعت کو ترجیح نہ دی۔

اسی زمانہ میں پنجاب کے چند سربرآوردہ لیڈروں کا ایک وفد مسٹر جناح کی خدمت میں گیا اور اس نے امتناعی رزولیوشن کے عمل سے پنجاب کو مستثنیٰ کرنے کی خواہش پیش کی مسٹر جناح نے ان کے تمام دلائل سننے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ پنجاب کو مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے جو لیگر وار کمیٹیوں میں شریک ہو گئے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ فوراً مستعفی ہو جائیں۔

اس کے بعد ورکنگ کمیٹی پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس ہوا وفد کا بیان سننے کے بعد کمیٹی نے صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا۔ اس پر پنجاب کے بعض لیگر وارکمیٹیوں سے مستعفی ہو گئے مگر بعض پھر بھی نہیں ہوئے۔

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اس آخری اجلاس میں جو ۳۱ اگست سے ۲ ستمبر تک بمبئی میں منعقد رہا، مسلمانوں کو وارکمیٹیوں میں شرکت کے لئے آزاد کرنے کے ساتھ اس غرض کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی کہ وہ ان لوگوں کے خلاف ڈسپلنری ایکشن لے جنھوں نے لیگ کے امتناعی رزولیوشن کی خلاف ورزی کر کے وارکمیٹیوں میں شرکت کی۔

ایک دو اخبارات نے جو مسلم لیگ کے موئید ہونے کی بھی دعویدار ہیں یہ لکھا ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ممانعت رفع کرنے کے بعد ڈسپلنری ایکشن لینے کے لئے کیوں کمیٹی بنائی گئی اور کیوں ان لوگوں کے خلاف ڈسپلنری ایکشن لیا جا رہا ہے جو وارکمیٹیوں میں شریک رہے کیونکہ اب تو وہ بھی شریک ہو سکتے ہیں جو پہلے شریک نہ تھے۔

پھر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہمارا تو پہلے ہی خیال تھا کہ پنجاب اور بنگال اس رزولیوشن سے مستثنیٰ ہیں"۔

اخبارات کا یہ حق ہے کہ وہ معاملات پر آزادی سے رائے قائم کریں، ان کے خیال میں جو بات صحیح ہے اس کی بے تکلف تائید کریں اور جو غلط ہے اس کو غلط کہیں۔ یہ معترض بھی اگر اس قسم کے آزاد اخبارات ہونے کے دعویدار ہیں تو ان کو یہ کہنے کا حق ہے کہ مسلم لیگ کا یہ فیصلہ غلط تھا کہ مسلمان وارکمیٹیوں میں شرکت سے احتراز کریں تاوقتیکہ صدر مسلم لیگ اور وائسرائے کے درمیان گفت و شنید کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو جائے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کو مستثنیٰ کر دینا چاہیئے تھا اور اگر انہیں کیا گیا تو غلطی کی گئی لیکن اس کے بعد کہ صدر اجلاس کسی رزولیوشن کا ارادہ نیت اور تعبیر بیان کر دے ان کو یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک یہ نیت، یہ ارادہ اور تعبیر ہے اور یہی صحیح ہے۔ صدر کی رائے کے اعلان کے بعد

انھیں اپنی رائے کی اصلاح کرنی پڑے گی۔

پھر یہ کہ جب ان سب ہی کو وار کمیٹیوں میں شرکت کی اجازت ہوگی جو محض ان میں شرکت مفید سمجھتے ہیں تو ان کے خلاف کیوں ڈسپلنری ایکشن لیا جائے جو پہلے ہی شریک ہو گئے تھے؟ گو بڑی نرمی سے کیا گیا ہے مگر بہت ہی عجیب اعتراض ہے ان کے خلاف ضرور ڈسپلنری ایکشن لیا جانا چاہئے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لیگ کے مطیع نہیں ہیں، یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اپنے میلان کے خلاف لیگ کے حکم سے چھوٹی سے چھوٹی قربانی بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے طرز عمل سے مخالف گروہوں پر اور حکومت پر یہ ظاہر ہوا کہ بعض ایسے مسلمان اور لیگر بھی ہیں جو لیگ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں، اور ان کی نظر میں لیگ کا وقار گھٹا، اور ان مقاصد کو ضعف پہنچا جن کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تائید کے زور پر اور اس دعوے کے ساتھ مسلم لیگ جنگ کر رہی ہے۔ یہ کہ یہ عالیات پھر بھی بڑی حد تک پورے ہو گئے، یہ مسلم لیگ کے تابع فرمان مسلمانوں کی کثرت اور تمام مسلم رائے عامہ کی تائید سے ہوا۔ لہٰذا یہ بدترین ناانصافی ہوگی کہ فرماں بردار اور نافرمان لیگر ایک صف میں بیٹھیں ان کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہو اور فتح کے جشن میں نافرمان بھی اسی طرح شریک ہوں جس طرح کے وہ فرماں بردار جن کے عزم و استقلال سے جیت ہوئی۔ اگر خدانخواستہ مسلم لیگ میں نافرمانوں کی کثرت ہوتی تو اس طرز عمل سے جو ان چند افراد نے اختیار کیا جن کے خلاف ڈسپلنری ایکشن لیا جانے والا ہے مسلم لیگ کو شکست فاش ہوتی۔ لہٰذا فرماں برداروں اور نافرمانوں کے درمیان فصل ہو جانا چاہیئے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں اور مسلمانوں میں یہ افسوسناک واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے مسلمانوں کے سامنے ایک عظیم مہم ہے۔ کامیابی کی آخری منزل پر پہنچنے تک مسلمانوں کو بڑی بڑی سخت قربانیاں کرنی پڑیں گی، اور مسلم لیگ ان سے مطالبہ کرے گی کہ وہ قربانیاں کریں اگر نافرمانی اور تمرد پر لاپروائی برتی جائے جیسا کہ یہ دوست مشورہ دے رہے ہیں تو مسلمان کبھی ان معاملات میں اطاعت نہیں کریں گے۔ جہاں انھیں ذاتی نقصان کا اندیشہ ہو اس معاملہ میں نرمی سرکشی اور خودرائی کی ترغیب ثابت ہوگی۔"

ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ لیگ میں بحمد اللہ اب اتنی قوت ہے کہ وہ اس قسم کی کھلی ہوئی بغاوتوں کے خلاف چارہ جوئی کر سکتی ہے۔ ہم مسلمانوں سے درخواست کریں گے کہ وہ لیگ کو اس قدر مضبوط بنا دیں کہ اس کے فیصلے کے خلاف لب کشائی کرنے اور قدم اٹھانے کی جرأت ہی نہ رہے۔ قومیں اسی طرح سے زندہ رہا کرتی ہیں۔

(۴) پھر لوٹے ؟

یاد ش بخیر جناب سر سکندر حیات خان صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے کی طرح جس دو گونہ عذاب میں گرفتار رہتے ہیں وہ محتاج تفصیل نہیں۔ مرکزی لیگ کا جلسہ کہیں ہو وہ اس میں شرکت کے لئے تشریف عزہ لیجاتے ہیں۔ لیکن وہاں ہر وقت یہ خیال وبال جان بنا رہتا ہے کہ وہ ہندو اور خالصہ بھائی جن کے صدقہ میں یہ ٹھاٹھ قائم ہیں۔ ناراض نہ ہو جائیں۔ اس خطرہ کے ازالہ کی انہوں نے یہ ترکیب سوچ رکھی ہے کہ اجلاس لیگ سے واپسی پر فوراً لیگ کی مخالفت میں ایک بیان شائع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ آپ نے بمبئی کے اجلاس کے بعد لاہور میں آکر ٹریبون کے نامہ نگار سے فرمایا۔

"میں آج بھی ہندوستان کی تقسیم کے مخالف ہوں اور میرا ابھی تک یہی عقیدہ ہے کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کی تقسیم ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ مثلاً پنجاب میں نہ کسی ایک فرقہ کی حکومت ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہیئے یہاں صرف "پنجابیوں" کی حکومت ہونی چاہیئے"

آپ کو یاد ہوگا کہ لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی میں تقسیم ہندوستان کی اس اسکیم کی تائید کی تھی جس کے متعلق لاہور کے سالانہ اجلاس میں قرارداد پاس کی گئی تھی۔ اس کے متعلق سوال کرنے پر سر سکندر نے فرمایا۔

"لیگ کی قرارداد کے متعلق بمبئی کے ریزولیوشن کے بعد بھی میری وہی پوزیشن ہے جو لاہور کے ریزولیوشن کے بعد تھی۔ اس میں مطلقاً کوئی فرق نہیں ہوا۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ لیگ کے ریزولیوشن کا مقصد بھی تقسیم ہندوستان نہیں ہے"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۲ ۹/۴۴)

سر سکندر خاں صاحب مختار ہیں کہ لیگ کی اسکیم کے متعلق جس قسم کی روش چاہیں اختیار کریں - اس حد تک بھی تو نہ بڑھ جائیں کہ جو کچھ میں کہتا ہوں لیگ کے ریزولیوشن کا بھی وہی مفہوم ہے - لیگ کی کھلی ہوئی مخالفت کرنا اور پھر نہایت دیدہ دلیری سے یہ کہنا کہ خود لیگ کا منشا بھی وہی ہے - بڑی جسارت ہے - اور محض اس لئے ہے کہ قوم میں باز پرس کی قوت موجود نہیں - قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے کہ -

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝ ۲/۷۹

پس افسوس ہے ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے - یہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں حقیر سی رقم دنیاوی فائدہ کی حاصل کرلیں - پس افسوس اس پر جو ان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو وہ اس کے ذریعے سے کماتے ہیں -

---

شاباش قارئین طلوع اسلام سندھ میں مسجد منزل گاہ کے قضیہ سے متعارف ہوں گے مسلمانوں کی حق بجانب تحریک سے گھبرا کر وہاں کے ہندو ارباب حکومت نے پریشانی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے انہیں کہاں سے صحیح مشورہ مل سکتا ہے - چنانچہ نگاہ انتخاب بجا طور پر جناب سر سکندر حیات خاں صاحب پر آکر رک گئی - رائے صاحب گوکل داس روچلانی وزیر سندھ جناب سر سکندر سے ملاقی ہوئے اور اس کے بعد انہوں نے اخبارات میں ایک بیان شائع کیا جس میں کہا کہ سر سکندر نے مجھے اس معاملہ میں حسب ذیل مشورہ دیا ہے -

"اکثریت کی حمایت حاصل کرکے اسمبلی میں سیاسی پارٹیوں کو منظم کرنا چاہیئے - اور اس کے بعد

فرقہ وار مصلحتوں کو نظر انداز کرکے جہاں ضرورت پڑے فوراً مضبوط کارروائی کرنا چاہیئے۔ اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے سر سکندر نے کہا کہ میں نے شیخ گنج ایجی ٹیشن کے سلسلے میں مضبوط قدم اٹھانے میں ذرا بھی آنا کانی نہیں کی تھی حالانکہ اسمبلی میں بعض مسلمان دوستوں نے مجھ پر نرم رویہ اختیار کرنے کے لئے زور ڈالا تھا۔ سر سکندر نے کہا کہ حکومت کے نام نہاد ظلم نے صوبہ کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اور یہ ظلم اس کرم سے اچھا تھا جس سے صوبہ کو انجام کار تباہی کا سامنا کرنا پڑتا؟ (ہندوستان ٹائمز نیز انقلاب مورخہ $\frac{9}{4}$ ۱۹)

کس قدر معرکۃ الآرا کارنامہ ہے جو اس فرزند توحید کے اعمال نامہ میں درخشندہ و تابناک حروف میں لکھا ہوا ہے اور جس کا وہ اس فخر و مسرت سے اعلان فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی ویسا ہی مشورہ دیتے ہیں۔

آفریں باد برایں ہمت مردانۂ تو

اندھے کی راہ نمائی

آپ نے سنا ہوگا کہ ایک بستی میں ایک بہت بڑے لال بجھکڑ تھے۔ جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا۔ لوگ ان سے حل دریافت کرتے ایک مرتبہ کوئی اس قسم کا لاینحل سا معاملہ پیش ہوگیا کہ اونٹ بڑا ہوتا ہے یا مرغا۔ لال بجھکڑ صاحب لائے مسئلہ متنازعہ فیہ پہ ایک غائر نگاہ ڈالی۔ ایک سرد آہ کھینچی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضور! خیریت ہے یہ پریشانی کیوں! کہا کہ نہیں اور تو کچھ نہیں۔ صرف اتنا خیال آ گیا کہ جب میں نہ ہوں گا تو تم ایسے سوالات کا حل کس سے پوچھا کروگے! لوگوں نے بھی ایک حسرت بھری آہ کھینچی اور کہا حضور! جو خدا کو منظور۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد لوگوں نے کہا کہ پھر جناب مسئلہ زیر نظر کا کیا حل ہے؟ فرمایا کہ اس کا حل تو مجھے بھی معلوم نہیں!

ہندوستان میں اس قسم کے لال بجھکڑوں کی کمی نہیں۔ کانگریس نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ یہ طے کر دیا کہ اب گاندھی جی قیادت کے قابل نہیں رہے۔ اس لئے انہیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مجلس عاملہ کا بمبئی میں اجلاس منعقد ہوا

اور وہاں پھر گاندھی جی سے کہا گیا کہ حضور! معاملات ایسے نازک ہیں کہ آپ کے بغیر ان کا حل کوئی نہیں بتا سکتا آپ پھر اس ذمہ داری کو سنبھالئے۔ گاندھی جی نے مسائل زیر نظر پر غائر نگاہ ڈالی قریب دو گھنٹے تک تقریر فرمائی جس کا ماحصل کچھ یوں ہی سمجھئے کہ جب میں نہ ہوں گا تو ان مسائل کا حل کون بتائے گا۔ اس کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ حضور! پھر اس نازک وقت میں کرنا کیا چاہیئے۔ فرمایا کہ

"تم نے ایک مرتبہ پھر کانگریس کی قیادت کی ذمہ داری میرے سپرد کی ہے اس کا مطلب شاید سول نافرمانی یا عدم تعاون ہوگا۔ لیکن سر دست میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا کروں گا۔ میں خود اندھیرے میں ہوں۔ یاد رکھو تم ایک ایسے آدمی کی قیادت تسلیم کر رہے ہو جو خود اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو"۔ (ہندوستان ٹائمز ۹/۴۰-۱۶)

یہ تو آپ نے سن لیا کہ خود گاندھی جی کو اقرار ہے کہ انہیں روشنی نہیں ملتی انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن جنہوں نے ان کی امامت قبول کی ہے انہیں اس سے غرض نہیں کہ ان کا امام اندھا ہے یا آنکھوں والا۔ انہیں امام مل گیا۔ اب ان کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ چنانچہ جب یہ ریزولیوشن پاس ہوا ہے۔ تو راشٹرپتی ابو الکلام صاحب آزاد نے اطمینان کا سانس لیکر فرمایا کہ الحمدللہ

"کئی ماہ کے بعد رات میں آرام کی نیند سویا۔ مہاتما جی نے پھر کشتی سنبھال لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم ان کی متابعت میں فتح کے دروازے تک ضرور پہنچ جائینگے"

(ہندوستان ٹائمز ۹/۴۰ ۱۷)

وہ ابو الکلام صاحب جو کبھی غیر مسلم کی راہ نمائی کو شرک قرار دیتے تھے اس غیر مسلم کی راہ نمائی پر سجدہ ہائے شکر ادا کرتے ہیں جو خود اعتراف کرتا ہے کہ میں اندھیرے میں ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ احسن تقویم ہو کر اسفل سافلین ہو جانا اسے کہتے ہیں۔

سب کی بُولی

ہندوستان سے مسلمانوں کے تمدن وتہذیب کو مٹانے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے جو مختلف حربے استعمال کئے جارہے ہیں۔ زبان کا مسئلہ ان میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ (ہم اس موضوع پر الگ پمفلٹ شائع کرچکے ہیں) اس زہرآلود حربہ کو اس نیام میں چھپایا جاتا ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک زبان کی ترویج نہایت ضروری ہے۔ یہ "ایک زبان" گاندھی جی کی اصطلاح میں۔ ہندی الفوا ہندوستانی ہوگی جب مسلمانوں نے اس مذموم تحریک کے خلاف شور اٹھایا تو ہندوؤں نے حسب معمول مسلمان نذروں کو حق نمک ادا کرنے کے لئے آگے بڑھایا اور جناب راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد نے یہ کہکر مسلمانوں کو مبتلائے فریب رکھنا چاہا کہ اس زبان سے مراد وہ بولی ہے جو شمالی ہندوستان کے شہروں (مثل لکھنؤ۔ دہلی) میں بولی جاتی ہے۔

یہ ہے راشٹرپتی صاحب کا ارشاد۔ اب یہ دیکھئے کہ اس ارشاد گرامی کی عملی تفسیر کیسے ہورہی ہے "منتری راشٹر بھاشا پرچار سمیتی۔ وردھا" نے اس نئی زبان کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "سب کی بولی"۔ یہ کتاب حکومتِ بمبئی کے لئے لکھی گئی تھی اور اس کا پہلا سنسکرن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کونسی زبان کی کتاب ہے۔ کتاب کا مقدمہ حسب ذیل ہے۔

"یہ کتاب ہم نے بمبئی سرکار کی سوچناؤں کے مطابق اس کے سیلبس کو سامنے رکھکر تیار کرایا ہے آسان سے مشکل کی اُوْر پرچیت سے اپرچیت کی اُور۔ چھوٹے سے بڑے کی اُوْر۔ اس بات کو دھیان میں رکھ کر پاٹھ لکھے گئے ہیں۔

پاٹھوں میں بناوٹ کی بو نہ آنے پاوے اس میں سُبھاؤ کتا بھرپور ہے اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

رشتوں کے چناؤ میں آدمیت - ہمدردی بھائی چارہ اور راشٹریہ ایکتا کو پہلا استھان دیا گیا ہے ۔

شبدوں کے استعمال میں اس بات پر خیال رکھا گیا ہے کہ عام بول چال کے لفظ ہی آنے پائیں اونچے شبدوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے - جیسے "طاقت" اور "بل" کا تو اپیوگ ہوا ہے، پر "قوت" اور "شکتی" سے بچا گیا ہے ۔

سامانیہ بولی کے الگ الگ شبد اپنی پردہانتا کے کارن ساتھ ہی ساتھ آئے ہیں - جیسے سمے - وقت آدمی ،منشیہ - ساہسی ، دلیر ، چڑیہ ، پنچھی ، پکشی ، پکھیرو ، آسمان ، آکاش ، پرارتھنا ، دعا ، دنیا سنسار وغیرہ

شبدوں کے چناؤ میں مراٹھی، گجراتی اور کنڑ بھاشاؤں کا بھی خیال رکھا گیا ہے - جو ہندوستانی لفظ ان زبانوں میں پہلے سے ہی ملے ہوئے ہیں ان کا استعمال اس کتاب میں پہلے ہو اس بات کی کوشش کی گئی ہے - جیسے مشکل ملک - قیمت ، گناہ مہربانی وغیرہ - کتاب کے پاٹھوں میں جنگل کی کہانیاں بھی آئی ہیں - لیکن آدمی کی بولی میں نہیں جیسے روٹی کا بٹوارہ - اس میں ایسی سنگت بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے ،جس سے وے اصلی جان پڑیں - نقلی نہیں ۔

ہم نے یہ کتاب ہندوستانی کا دیا کرن (قواعد) سکھانے کے مقصد سے پاٹھوں کو ویاکرن کے سانچے میں ڈہال کر تیار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے - اس میں ویاکرن کا استعمال اسی طرح ہوا ہے جس طرح دال میں نمک - پاٹھوں سے رو چکتا ، تازگی سبھاوکتا وغیرہ دور نہ ہو جائیں ہمارا اس پر پورا دھیان رہا ہے - پھر بھی ہر ایک - ہی شبد میں پورا واکیہ بن گیا ہے ویاکرن کی درشٹی سے بھی اس کا استعمال بڑی سہولیت کے ساتھ ہوا ہے اور کہانی کا سلسلہ بھی اپنی خاص رو چکتا کے ساتھ بڑھتا چلا ہے ۔

ہر ایک پاٹھ کے نیچے پڑھنے والوں کے لئے ابھیاس کے سوال اور پڑھانے والوں کے واسطے دیاکرن ، محاوروں ، کہاوتوں وغیرہ کی سوچنا وستار کے ساتھ دی گئی ہے تاکہ پڑھانے میں

شکنکوں کو کافی سہولیت ہو۔ شوق سے پڑھتے ہوئے ۔ اس ایک ہی کتاب سے ہنسی کھیل میں ہی بھاشا کی سادھارن بناوٹ کی جانکاری ہو جائے ایسا پریتن کیا گیا ہے ۔

ہندو مسلمان وغیرہ ہندوستان کی بڑی بڑی قوموں کے اتہاس ۔ رسم، رواج، ورت تیوہار سنت مہاتما، سوُر ویر نر ناریوں کو مدنظر رکھ کر ایسے پاٹھ تیار کرنے کا پریتن کیا گیا ہے جس سے وِشیوں کی جانکاری حاصل ہونے کے علاوہ ہندوستان کے بچوں کو ایک دوسرے کے پرتِ پریم بڑھے اور شے ہل مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے مچل اٹھیں ۔ عید کا چاند، دشہرا، ہولی یا ندبی بی کی بہادری وغیرہ اس کے نمونے ہیں ۔

وِشیوں کے چناؤ میں پرانتیہ وشیشاؤں پر بھی نظر رکھی گئی ہے ۔ ہمارے بچے اپنے صوبہ کے گورو سے پرچیت ہوتے ہوئے ۔ اس سے اپنا پن کا ناتا قائم رکھتے ہوئے اپنا سمبندھ وراٹ بھارت سے ستھاپت کر سکیں ۔ ایسا پریتن کیا گیا ہے ۔ یہی کا کھنڈر ۔

اس پستک کے تیار کرنے میں شری راما نند شرما نے جو پریشرم کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے آبھاری ہیں ۔

ساتھ ہی اس پستک کو اردو لپی میں لکھنے میں فرگیوسن کالج کے فارسی و اردو کے پروفیسر شری بھگوت دیال ورما جی نے جو سہایتا دی ہے ۔ اس کے لئے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں ۔ یہ کاشک "

دیباچہ ملاحظہ فرما لیا آپ نے ! اس کے معنی کیا ہوئے ! یہ ہم سے نہیں جناب راشٹرپتی صاحب سے پوچھئے جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی حفاظت کے سب سے بڑے اجارہ دار ہیں ۔ یا جمعیت العلماء سے پوچھئے جو ہندوستان راجیہ میں تہذیب اسلامی کے تحفظ کے لئے ایک جداگانہ محکمہ کے فریب میں مبتلا ہے ۔

دیباچہ کے بعد حروف تہجی لکھے گئے ہیں ۔ ان کا عنوان ہے

ورن مالا ـــــ سُر ـــــ ڈیجنٹ ۔

سمجھے آپ ! اس کے بعد کتاب پڑھنے اور پڑھانے کے متعلق کچھ ہدایات ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیے

ہدایت

۱۔ کچھ اکشروں کے پرانے روپ ذرا بھن ہوتے ہیں ۔

۲۔ ٹیکٹک پرانے رُوپوں سے بھی لڑکوں کو پرچیت کرادیں ۔

۳۔ کچھ اکشروں کے نیچے بندی لگانے سے نیچے لکھے اردو حروف بنتے ہیں ۔

ق ۔ خ ۔ غ ۔ ز ۔ ڑ ۔ ڑھ ۔ ف ۔ ظ ۔ ض ۔ ز

۴۔ ہندی والے اکشروں کا اُچارن گلے پر زور ڈال کر کرنا ہوتا ہے ٹیکٹک بھلی بھانت سکھادیں ۔

اس کے بعد کچھ اکشروں کی بارہ کھڑی درج کی گئی ہے اور اس کے نیچے حسب ذیل ہدایات ہیں

ہدایت

۱۔ اوپر کی بارہ کھڑی میں دِر ۔ رُ ۔ رُو ۔ ہر" ان صورتوں پر خاص طور سے دھیان دلایا جائے

۲۔ باقی اکشروں کی بارہ کھڑی گ کی طرح ہی ہوتی ہے ۔

۳۔ انسوار کے علاوہ چندر بندکا پریوگ بھی بتایا جائے ۔

جیسے ہنس (کیکشی) ہنس (مصدر ہنسنا) انک ۔ آنکھ

جہاں چندر وِندُ (یعنی الٹے جزم) کا استعمال ہوتا ہے وہاں ناک سے انسیوار کا آدھا تلفظ کیا جاتا ہے ۔ٹیکٹک یہ بھید اچھی طرح بتادیں ۔

تشدید والے حرف دو دفعہ پڑھنے چاہیئے ۔جیسے فرُخ ۔ ہمّت ۔

اس کے بعد سنکھیا کی تفصیل ہے ۔سمجھیئے کہ اس کا کیا مطلب ہے ۔ اس کا مطلب ہے "گنتی"۔ از اں بعد پاٹھ شروع ہو جاتے ہیں ۔ ان پاٹھوں میں کسی ثقیل اور غیر معروف ہمالے علم" کے کتنے الفاظ ہیں یہ نہ پوچھئے ۔ پوچھئے یہ کہ اس میں عام فہم الفاظ کتنے ہیں ۔ انہیں ہم انگلیوں پر گنا دیں گے ۔ ہر ایک پاٹھ کے بعد ابھیاس" ہے جس کے نیچے کچھ اس قسم کا لکھا ہوا ہے ۔

نیچے لکھے شبدوں سے الگ الگ واکیہ بناؤ "

اس سبق میں پہلے پاٹھ کے دیاکرن پریوگ دہرائے گئے ہیں ان کا ابھیاس کرایا جائے ۔

چند ایک الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

بہدھا ۔ سماچار ۔ نیتا ۔ ادبھت ۔ ادہکار ۔ ادھین ۔ ادھیاپک ۔ انوداد ۔ اپمان ۔

ابھیمان - انرکت - اسمبھو - سوتنترتا - منیشہ - پرتشٹھا - اتم شریشٹھ - دھون - سرلتا - آدر - اپاسنا انتی - اپیوگ - اپواس - انساہت - بھوگ ولاس - ادبھت چمتکار - نکٹ - پریاپت - ستھاپت پرکرت - کلابھمان - پرستھان - آپت - وشیش - سندھ - اسادہانی - کرودھ - یدھ - یک - آوشک - شٹیوریہ - آتم تیاگی - سواستھیہ - پرشنسا - پوکھرا - تیھارتھ - دہاڑھی -

کہاں تک لکھے جائیں - شروع سے آخر تک کتاب اس قسم کے الفاظ سے بھری پڑی ہے فقروں میں یہ الفاظ کچھ اس انداز سے جلوہ ریز ہیں -

"جب یہ نگر آباد ہوگا تب کتنا وشال اور کتنا بھویہ ہوگا" - کنک درس آدھار پشوں کا سمبندھ رہا ہے جس وجے نگر پر ایک سمے بھارت کو ابھمان تھا اس وجے نگر کو کھنڈر کی حالت میں دیکھکر آدمی اچرج میں پڑ جاتا ہے - سمے کی گتی کتنی آدبھت ہے

کچھ گریمر کے الفاظ بھی دیکھتے جائیے -

سنگیا (اسم) کریا (فعل) سرونام (ضمیر) وشیشن (صفت) پل لنگ (مذکر) استری لینگ (مؤنث) واکیہ (جملہ) ایک وچن (واحد) بہو وچن (جمع) ورتمان کال (زمانہ حال) بھوشیت (مستقبل) بھوت (ماضی) سکرمک کریا (فعل متعدی) اکرمک کریا (فعل لازم) اتم پرش (متکلم) مدھیم پرش (مخاطب) آگیا واچک کردا (امر)

تو ہے زبان - دو ایک مثالیں تعلیم کی بھی سن لیجئے - ایک نظم ہے

ہندو مسلمان عیسائی   دیکھ سبھی ہیں بھائی بھائی
بھارت ماتا سب کی ماتا   گنگا دیوی سب کی مائی
رام سمجھ رحمان سمجھ لے   دھرم سمجھ ایمان سمجھ لے
مسجد کیسی مندر کیسا!   ایشور کا استھان سمجھ لے
کر دونوں کی سیر بابا   کوئی نہیں ہے غیر (ص ۴۳)

"اتر بھارت کی ہولی" کے سبق میں ایک لڑکا ہندو اور دوسرا مسلمان ہے۔ ہندو لڑکا ہولی کے فلسفہ پر تقریر کرتا ہے تو مسلمان لڑکا اس کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد۔

رحیم (ہاتھ میں دھول اٹھا کر) بھائی رمیش سچ مچ تم نے مجھے رلا دیا۔ رنگ سے مجھے محبت نہیں ہے۔ لیکن وطن کی اس خاک پر میں نثار ہوں۔ آؤ حسرت بھرے دل سے یہ خاک تمہارے ماتھے پر میں لگا دوں۔ پھر تم بھی اپنے ہاتھوں سے ماتھے پر لگا دینا۔ وطن کی یہ دھول۔ اہا کتنی پیاری ہے (دونوں دھول لگاتے ہیں۔ دونوں تھوڑی دیر چپ رہتے ہیں۔ پھر دونوں اتر بھومی کو پرنام کرتے ہیں") ص ۱۰۴

یہ ہے نمونہ اس کتاب کا جو راشٹر بھاشا پرچار سمیتی۔ کی زیر نگرانی۔ گاندھی جی کے آشرم ورد ہا سے شائع ہوئی ہے اور ہندو مسلمان۔ سب بچوں کو مشترکہ طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اور اس زمانہ میں جب کانگریس کے صدر "مسلمانوں کے حقوق کے سب سے بڑے محافظ" حضرت امام الہند صاحب ہیں۔ لیکن گلہ نہ کانگریس پر ہے نہ اس کے مسلمان ہیروں پر۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت تک ان چیزوں کے خلاف کیا کیا؟ انہوں نے دو چار ریزولیشن پاس کئے۔ پانچ سات تقریریں ہوئیں۔ اور اس موضوع کو لیپٹ کر الگ رکھ دیا اور سمجھ لیا کہ نشانہ ٹھکانے لگا ہے۔ اب "شکار گھر جا کر خود مر جائے گا" آپ کہیں گے کہ لیگ نے اس کے لیئے کیا کیا! اور ہم یہ پوچھیں گے کہ آپ نے لیگ کے لئے کیا کیا؟

مسلمانوں! ہوش میں آؤ۔ سابقہ بڑی ہوشیار اور خوفناک قوم سے پڑا ہے۔ تم میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اور وہ قوم نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے منصوبوں کو عملاً پورا کرتی چلی جاتی ہے۔ غور کرو کہ اس کا انجام کیا ہوگا!

طلوعِ اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا

سٹ

گزشتہ دو سال میں سیاست ہندیہ میں مسلمانوں سے متعلق کون کون سے اہم مسائل پیدا ہوئے اور اہل الرائے حضرات نے انہیں کتاب وسنت کی روشنی میں کس طرح دیکھا ؟

اگر

آپ اپنے طور پر معلوم کرنا چاہیں تو آپ کو دقت ہوگی

لیکن

اگر آپ ہم سے دریافت کریں تو ہم بڑی آسانی سے آپ کو بتا سکیں گے ۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ان پمفلٹوں میں موجود ہے جو اس دوران میں طلوع اسلام کی طرف سے شائع کئے جاتے رہے ہیں اور جو ہزار کی تعداد میں ملک میں تقسیم ہو چکے ہیں یہ پمفلٹس نہ صرف سیاست بلکہ دین کے اور شعبوں سے متعلق اہم مسائل پر بھی معلومات کا عمدہ ذخیرہ اپنے اندر رکھتے ہیں ۔

سٹ میں حسبِ ذیل پمفلٹ موجود ہیں

(۱) دارد ھا اسکیم اور مسلمان — ۴۴ صفحات ۴ ؍

(۲) سوراجی مسلمان — ۴۳ صفحات ۳ ؍

(۳) زبان کا مسئلہ — ۳۶ صفحات ۲

(۴) خدا کی بادشاہت — ۲۸ صفحات ۲ ؍

(۵) اسلام اور مذہبی رواداری — ۲۲ صفحات ۲ ؍

(۶) متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی — ۶۲ صفحات ۲

(۷) عرضداشت بخدمت علمائے کرام — ۲۴ صفحات ۱ ؍

(۸) اشتراکیت اور اسلام — ۸۰ صفحات ۳ ؍

(۹) مسلمان کی زندگی — ۲۲ صفحات ۲ ؍

(۱۰) کانگریس بے نقاب — ۲۶ صفحات ۲ ؍

(۱۱) راشٹر پتی ابوالکلام آزاد — ۳۰ صفحات ۱ ؍

(۱۲) شخصیت پرستی — ۵۲ صفحات ۲ ؍

(۱۳) علم حدیث — ۲۲ صفحات ۲ ؍

(۱۴) جہان نو — ۸۰ صفحات ۴ ؍

(۱۵) اسلامی معاشرت — ۵۲ صفحات ۴ ؍

یعنی ۶۴۴ صفحات کا مجموعہ دو روپیہ ۲ (عِہ) میں علاوہ محصول ڈاک) طلوع اسلام کے نمونے کے لئے ۴ ؍ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ شمیم منزل ۔ شیدی پورہ ۔ دہلی

اسلامی معاشرت

نقش ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمان کی روزمرّہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدن و معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب۔ اس کے دنیائی معاملات۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کرلیا جائے تو طلبا کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے

قیمت ۔ ۴ر محصول ا ر

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

رجسٹرڈ ڈاک نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع - زیادہ سے زیادہ - دس تاریخ تک دیجئے - ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو - اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے - جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے - اور قیمت فی پرچہ (۰/۸) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی - پی - طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جُرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے - نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں - اس لیے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے - ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا - کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوعِ اسلام**"، کوئی تجارتی ادارہ نہیں - بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لیے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت **خدا** کو اپنے درمیان رکھیں - وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَان

(۱۳) نمونے کے پرچے کیلئے ۰/۴ رکے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام
دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi